جاوید احمد غامدی

نبی کی ضرورت

انسان کو جس طرح یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ تمثیل و استقرا کے ذریعے سے استنباط کرتا ہے، جزئیات سے کلیات بناتا ہے، پھر اُن سے جزئیات پر حکم لگاتا ہے، بدیہیات سے نظریات تک پہنچتا ہے اور نامحسوس کو محسوس پر قیاس کرتا ہے، اِسی طرح یہ صلاحیت بھی اُس کو دی گئی ہے کہ وہ خیر و شر میں امتیاز کرتا اور نیکی اور بدی کو الگ الگ پہچانتا ہے، بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر وہ اپنے پروردگار کی معرفت اور اُس کی عدالت کے شعور سے بھی خالی نہیں ہے۔ انسان کے بارے میں یہ حقائق ہم اِس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا نبی کی ضرورت اِس لیے نہیں ہے کہ وہ انسان کو اِن چیزوں سے واقف کرائے۔ یہ سب چیزیں تو اُس کی خلقت کا حصہ اور اُس کی تخلیق کے پہلے دن ہی سے اُس کی فطرت میں ودیعت ہیں۔ قرآن کی جو آیت سرعنوان ہے، اُس سے واضح ہے کہ یہ ضرورت اِن چیزوں سے واقف کرانے کے لیے نہیں، بلکہ دو وجوہ سے پیش آئی ہے:

اولاً، اتمام ہدایت کے لیے۔ یعنی انسان کی فطرت میں جو کچھ بالاجمال ودیعت ہے اور جو کچھ وہ ہمیشہ سے جانتا ہے، اُس کی یاددہانی کی جائے اور اُس کی ضروری تفصیلات کے ساتھ اُس کے لیے اُسے بالکل متعین کر دیا جائے:

وَ جَعَلۡنٰہُمۡ اَئِمَّۃً یَّہۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا، وَ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡہِمۡ فِعۡلَ الۡخَیۡرٰتِ وَ اِقَامَ الصَّلٰوۃِ وَ اِیۡتَآءَ الزَّکٰوۃِ، وَ کَانُوۡا لَنَا عٰبِدِیۡنَ. (الانبیاء ۲۱: ۷۳)	''اور اِن (نبیوں) کو ہم نے امام بنایا جو ہماری ہدایت کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے اِنھیں وحی کے ذریعے سے نیک کاموں کی اور نماز کا اہتمام کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت فرمائی۔

اور وہ ہمارے ہی عبادت گزار تھے۔‘‘

ثانیاً، اتمام حجت کے لیے۔ یعنی انسان کو غفلت سے بیدار کیا جائے اور علم و عقل کی شہادت کے بعد اِن نبیوں کے ذریعے سے ایک دوسری شہادت بھی پیش کر دی جائے جو حق کو اِس درجہ واضح کر دے کہ کسی کے پاس کوئی عذر باقی نہ رہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ، اَلَمْ یَاْتِکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیٰتِیْ وَیُنْذِرُوْنَکُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ ھٰذَا، قَالُوْا: شَھِدْنَا عَلٰٓی اَنْفُسِنَا، وَغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا، وَشَھِدُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ اَنَّھُمْ کَانُوْا کٰفِرِیْنَ. ذٰلِکَ اَنْ لَّمْ یَکُنْ رَّبُّکَ مُھْلِکَ الْقُرٰی بِظُلْمٍ وَّاَھْلُھَا غٰفِلُوْنَ. (الانعام ۶: ۱۳۰-۱۳۱)

’’اے گروہ جن و انس، کیا تمھارے پاس خود تمھارے ہی اندر سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تمھیں میری آیتیں سناتے اور اِس دن کی ملاقات سے خبردار کرتے تھے؟ وہ کہیں گے: ہاں، ہم اپنے خلاف خود گواہی دیتے ہیں — اور اُن کو دنیا کی زندگی نے دھوکے میں ڈالے رکھا اور اپنے خلاف خود گواہ بنے کہ بے شک، وہ کفر میں پڑے رہے — یہ اِس لیے کہ تمھارا پروردگار بستیوں کو اُن کے ظلم کی پاداش میں ہلاک کرنے والا نہیں ہے، جبکہ اُن کے باشندے حقیقت سے بے خبر ہوں۔‘‘

البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانفال

(۹)

(گذشتہ سے پیوستہ)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا
مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ
فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۷۲﴾

(ایمان والو، اِس صورت حال میں اگر کوئی مسلمان حمایت و نصرت کا خواہاں ہو تو اُس سے کہو کہ مدینہ آ جائے۔ اِس لیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا ہے، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور (اُن کی) مدد کی ہے، وہی ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر ہجرت کر کے (مدینہ) نہیں آئے، تمھارا اُن سے حمایت و نصرت کا کوئی رشتہ نہیں ہو سکتا، جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں[۱۱۸]۔ ہاں، اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو اُن کی مدد کرنا تم پر فرض ہے[۱۱۹]، لیکن کسی

۱۱۸؎ اُس زمانے کے عرب میں ایک دوسرے کی حمایت و نصرت کے بغیر کسی شخص کے لیے جینا آسان نہیں تھا۔

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْہُ تَکُنْ فِتْنَۃٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ
کَبِیْرٌ ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا

ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمھارا معاہدہ ہو۔ (یاد رکھو)، جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔[120] جو لوگ منکر حق ہیں، وہ ایک دوسرے کے حامی و ناصر ہیں، (اِس لیے ایمان والو)، تم (اپنے اِن مظلوم بھائیوں کے لیے) یہ نہیں کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔[121] (یہ بات اب تم میں سے ہر شخص کو سمجھ لینی چاہیے کہ) جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد

اسلام سے پہلے یہ حمایت و نصرت ہر شخص کو اُس کے خاندان اور قبیلے کے تعلق سے حاصل تھی۔ کوئی شخص یا خاندان کسی خطرے یا مصیبت میں مبتلا ہوتا تو خاندان اور قبیلے کے لوگ اُس کی حمایت و مدافعت کے لیے سربہ کف ہو جاتے تھے۔ اسلام قبول کر لینے کے بعد مسلمان ہر جگہ اِس سے محروم ہونا شروع ہو گئے۔ پھر حالت جنگ نے اِس صورت حال کو اور بھی سنگین بنا دیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ منکروں کے درمیان رہ رہے ہیں اور محض اپنے ایمان کی وجہ سے بے یارومددگار ہو گئے ہیں، اُن کے لیے کیا کیا جائے؟ سورہ کے آخر میں یہ قرآن نے اِس سوال کا جواب دیا ہے کہ یہ حمایت و نصرت اُسی صورت میں ممکن ہے، جبکہ یہ لوگ ہمت کر کے ایک قدم اور آگے بڑھائیں اور ہجرت کر کے مدینہ آجائیں۔ ایمان و اسلام کی بنیاد پر حمایت و نصرت کا جو تعلق انصار و مہاجرین میں قائم ہو چکا ہے، وہ ہجرت کے بعد ہی ممکن ہے اور اِسی نے اُن کو خدا کی راہ میں جہاد و قتال کے لیے بنیان مرصوص بنا دیا ہے۔ نئے ایمان لانے والے بھی آگے بڑھیں اور ایمان کے اِس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اُن کے ساتھ شریک جہاد ہوں۔ جس حمایت و نصرت کے وہ خواہاں ہیں، اِس کے نتیجے میں وہ آپ سے آپ اُن کو حاصل ہو جائے گی۔

۱۱۹؎ یعنی جس چیز کی نفی کی گئی ہے، وہ علی الاطلاق حمایت و نصرت کی ذمہ داری ہے۔ رہی یہ بات کہ کسی شخص کو دین کے معاملے میں ستایا جائے اور وہ طالب مدد ہو تو اُس کی مدد کرنا تم پر فرض ہے۔ یہ اِس لیے فرمایا کہ اُس وقت مسلمانوں کی ایک منظّم حکومت مدینہ میں قائم ہو چکی تھی اور اپنی طاقت کے لحاظ سے بھی وہ اِس کے اہل تھے کہ اِس ذمہ داری کو اٹھا سکیں۔

۱۲۰؎ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے کہ اخلاقیات ہر حال میں اور ہر چیز پر مقدم ہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی اِن سے انحراف کی اجازت نہیں ہے۔ اِس ذیل میں سب سے اہم چیز عہد کی پابندی ہے۔ چنانچہ کوئی معاہد قوم اگر

وَّ نَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿۷۴﴾ وَالَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ

کیا، اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) پناہ دی اور (اُن کی) مدد کی ہے، وہی سچے مومن ہیں۔ اُن کے لیے مغفرت ہے اور عزت کی روزی ہے[۱۲۲]۔ اور جو اِس کے بعد ایمان لائیں اور ہجرت کریں اور تمھارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، وہ بھی تمھی لوگوں میں سے ہوں گے[۱۲۳]۔ خون کے رشتہ دار،

مسلمانوں پر ظلم بھی کر رہی ہو تو معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اُن کی مدد نہیں کی جا سکتی۔ اِس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے معاہدے کو علانیہ ختم کر دیا جائے۔

۱۲۱؎ یہ وجہ بیان ہوئی ہے کہ خاص دین کے معاملے میں یہ مدد کیوں ضروری ہے؟ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...فرمایا کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کی عداوت کا تعلق ہے، اِس معاملے میں تمام کفار ایک دوسرے کے دست و بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے، اُس کی تعذیب و ایذا رسانی سب کے نزدیک کار ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اُس کو بچانے کے لیے اُس کے اپنے بھائی بندوں کی حمیت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اُس کا مال اور اُس کی جان، سب مباح ہیں۔ ایسی حالت میں اگر تم بھی اِن مظلوموں کی مدد نہ کرو گے تو اِس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے پھیرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔''

(تدبر قرآن ۳/۵۱۸)

۱۲۲؎ یہ اُس وقت کی صورت حال میں ہجرت اور جہاد کی ترغیب و تشویق ہے۔ قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اِس وقت یہی دو چیزیں صداقت کی کسوٹی ہیں۔ جو شخص بھی ایمان کا دعویٰ رکھتا ہے، اُس کے لیے ضروری ہے کہ ہجرت کر کے مدینہ آئے اور انصار و مہاجرین کے دوش بدوش اہل کفر کے خلاف جہاد میں شریک ہو۔ سچا ایمان اِس وقت کسی کو مہاجر بننے کی سطح پر ملے گا اور کسی کو انصار بننے کی سطح پر۔ اِن کے سوا کوئی دوسری صورت نہیں ہے۔ اِس سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ دین کی نصرت کے لیے ہجرت اور جہاد ایمان کے ایسے تقاضے ہیں کہ جب اِن کا موقع آ جائے تو کوئی چیز بھی اِن کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ہر مسلمان سے اُس وقت ایمان کا پہلا اور آخری تقاضا یہی دو چیزیں ہوتی ہیں۔

۱۲۳؎ یعنی بعد میں آنے والوں کے لیے بھی تمھارے دل میں کوئی تنگی نہیں ہونی چاہیے۔ خدا نے آج تمھیں اپنی

بَعۡضُهُمۡ اَوۡلٰی بِبَعۡضٍ فِیۡ کِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۷۵﴾

البتہ خدا کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔[۱۲۴] ۷۲-۷۵

دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق دی ہے تو اِس پر خدا کا شکر ادا کرو۔ وہی کل دوسروں کو بھی اِس کی توفیق دے گا۔ اُن کا استقبال کسی احساسِ برتری کے ساتھ نہیں، بلکہ محبت و شفقت کے جذبات کے ساتھ ہونا چاہیے۔ اِس میں، ظاہر ہے کہ نئے آنے والوں کے لیے ایمان و اسلام اور ہجرت و جہاد کے لیے ترغیب و تشویق بھی ہے۔

۱۲۴؎ یہ برسرموقع یاددہانی ہے کہ اوپر جس حمایت و نصرت کا ذکر ہوا ہے، اُس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ رحمی رشتوں کی بنیاد پر جو حقوق و فرائض اللہ تعالیٰ نے قائم فرمائے ہیں، وہ تبدیل کر دیے گئے ہیں۔ ہرگز نہیں، وہ سب حقوق و فرائض بدستور قائم رہیں گے۔ رحم و قرابت اور اُس کی بنیاد پر وراثت وغیرہ کے حقوق خدا کے ابدی قانون کا حصہ ہیں۔ یہ حمایت و نصرت اُن میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔ وہ ہر حال میں مقدم ہوں گے اور ایمان و اسلام کی بنیاد پر حمایت و نصرت کے ہر تقاضے سے پہلے پورے کیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ہدایت اُس کے بے خطا علم پر مبنی ہے۔ اُس نے ہر چیز کا ایک محل اور مقام متعین کر دیا ہے۔ تمام حقوق و فرائض اُسی کے مطابق ادا کرنے چاہییں۔

محمد رفیع مفتی

غسل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

۱۔عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اغْتَسَلَ مِنَ الْجَنَابَةِ يَبْدَأُ فَيَغْسِلُ يَدَيْهِ ثُمَّ يُفْرِغُ بِيَمِيْنِهِ عَلٰى شِمَالِهِ فَيَغْسِلُ فَرْجَهُ ثُمَّ يَتَوَضَّأُ وُضُوْءَهُ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ يَأْخُذُ الْمَاءَ فَيُدْخِلُ أَصَابِعَهُ فِيْ أُصُوْلِ الشَّعْرِ حَتّٰى إِذَا رَاٰى أَنْ قَدِ اسْتَبْرَأَ حَفَنَ عَلٰى رَأْسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ ثُمَّ أَفَاضَ عَلٰى سَائِرِ جَسَدِهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ. (مسلم، رقم ۷۱۸)

حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنابت سے غسل کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو دھونے سے شروع فرماتے، پھر اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ پر پانی ڈال کر اپنی شرم گاہ دھوتے، پھر نماز کے وضو کی طرح وضو فرماتے، پھر پانی لے کر اپنی انگلیوں کو بالوں کی جڑوں میں ڈالتے، یہاں تک کہ جب آپ دیکھتے کہ وہ صاف ہو گیا ہے تو اپنے سر پر تین چلو پانی ڈالتے، پھر اپنے پورے جسم پر پانی ڈالتے، پھر اپنے دونوں پاؤں دھوتے۔

۲۔عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: حَدَّثَتْنِيْ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةُ قَالَتْ: أَدْنَيْتُ لِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غُسْلَهُ مِنَ الْجَنَابَةِ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا

ثُــمَّ أَدُخَلَ يَدَهُ فِى الْإِنَاءِ ثُمَّ أَفُرَغَ بِهِ عَلٰى فَرُجِهِ وَغَسَلَهُ بِشِمَالِهِ ثُمَّ ضَرَبَ بِشِمَالِهِ الْأَرُضَ فَدَلَكَهَا دَلُكًا شَدِيُدًا ثُمَّ تَوَضَّأَ وُضُوءَ هُ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ أَفُرَغَ عَـلٰى رَأُسِهِ ثَلَاثَ حَفَنَاتٍ مِلُءَ كَفِّهِ ثُمَّ غَسَلَ سَائِرَ جَسَدِهِ ثُمَّ تَنَحّٰى عَنُ مَقَامِهِ ذٰلِكَ فَغَسَلَ رِجُلَيُهِ ثُمَّ أَتَيُتُهُ بِالُمِنُدِيُلِ فَرَدَّهُ. (مسلم، رقم ۷۲۲)

حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) بیان کرتے ہیں کہ میری خالہ سیدہ میمونہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں غسل جنابت کے لیے پانی رکھا تو آپ نے پہلے دونوں ہاتھ دو یا تین مرتبہ دھوئے، پھر اپنا ہاتھ برتن میں ڈالا اور اس سے اپنی شرم گاہ پر پانی بہایا اور اسے بائیں ہاتھ سے دھویا، پھر اپنا یہ ہاتھ زمین پر اچھی طرح رگڑا، پھر نماز کے لیے جس طرح وضو کرتے ہیں، اسی طرح وضو کیا، پھر چلو میں بھر کر تین مرتبہ پانی سر پر بہایا، پھر سارا بدن دھویا، پھر اس جگہ سے ہٹے اور دونوں پاؤں دھوئے۔ پھر میں رومال (تولیہ) لے آئی جو آپ نے واپس کر دیا۔

وضو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ

۳۔عَـنُ حُـمُـرَانَ مَوُلٰى عُثُمَانَ ... أَنَّهُ رَاٰى عُثُمَانَ بُنَ عَفَّانَ دَعَا بِإِنَاءٍ فَـأَفُـرَغَ عَـلٰى كَـفَّيُـهِ ثَلَاثَ مِـرَارٍ فَـغَسَـلَهُـمَـا ثُمَّ أَدُخَلَ يَمِيُنَهُ فِى الْإِنَاءِ فَمَضُمَضَ وَاسُتَنُشَقَ ثُمَّ غَسَلَ وَجُهَهُ ثَلَاثًا وَيَدَيُهِ إِلَى الُمِرُفَقَيُنِ ثَلَاثَ مِرَارٍ ثُـمَّ مَسَـحَ بِـرَأُسِـهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجُلَيُهِ ثَلَاثَ مِرَارٍ إِلَى الُكَعُبَيُنِ ثُمَّ قَالَ: قَالَ: رَسُـوُلُ الـلّٰـهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيُهِ وَسَلَّمَ مَنُ تَوَضَّأَ نَحُوَ وُضُوئِىُ هٰذَا ثُمَّ صَلّٰى رَكُعَتَيُنِ لَا يُحَدِّثُ فِيُهِمَا نَفُسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنُ ذَنُبِهِ. (بخاری، رقم ۱۵۹)

حضرت عثمان (رضی اللہ عنہ) کے مولیٰ حُمران سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت عثمان بن عفان

(رضی اللہ عنہ) کو وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے، انھوں نے (حمران سے) پانی کا برتن مانگا، پھر اپنی ہتھیلیوں پر تین مرتبہ پانی ڈالا، پھر انھیں دھویا، پھر اپنا داہنا ہاتھ برتن میں ڈالا، اور (پانی لے کر) کلی کی اور ناک صاف کیا، پھر تین بار اپنا چہرہ دھویا اور کہنیوں تک تین بار دونوں ہاتھ دھوئے، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر (پانی لے کر) ٹخنوں تک تین مرتبہ اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔ پھر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص میری طرح ایسا وضو کرے، پھر ایسی دو رکعت نماز پڑھے، جس میں اپنے نفس سے کوئی بات نہ کرے تو اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

۴۔عَنْ یَحْیٰی الْمَازِنِیِّ أَنَّ رَجُلًا قَالَ لِعَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَیْدٍ وَهُوَ جَدُّ عَمْرِو بْنِ یَحْیٰی أَتَسْتَطِیْعُ أَنْ تُرِیَنِیْ کَیْفَ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَتَوَضَّأُ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنِ زَیْدٍ: نعم، فَدَعَا بِمَاءٍ فَأَفْرَغَ عَلٰی یَدَیْهِ فَغسَلَ مَرَّتَیْنِ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا ثُمَّ غَسَلَ یَدَیْهِ مَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ إِلَی الْمِرْفَقَیْنِ ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِیَدَیْهِ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَأَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ حَتّٰی ذَهَبَ بِهِمَا إِلٰی قَفَاهُ ثُمَّ رَدَّهُمَا إِلَی الْمَکَانِ الَّذِیْ بَدَأَ مِنْهُ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْهِ. (بخاری، رقم ۱۸۵)

حضرت یحییٰ المازنی سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے عبداللہ بن زید (رضی اللہ عنہ) جو عمرو بن یحییٰ کے دادا ہیں، ان سے پوچھا کہ کیا آپ مجھے (عملاً وضو کر کے) دکھا سکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح وضو کیا؟ عبداللہ بن زید (رضی اللہ عنہ) نے کہا کہ ہاں، پھر انھوں نے پانی کا برتن منگوایا، پہلے اپنے ہاتھوں پر پانی ڈالا اور دو مرتبہ ہاتھ دھوئے، پھر تین مرتبہ کلی کی، تین بار ناک صاف کی، پھر تین دفعہ اپنا چہرہ دھویا، پھر کہنیوں تک اپنے دونوں ہاتھ دو دو مرتبہ دھوئے، پھر اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کا مسح کیا، اس طور پر اپنے ہاتھ (پہلے) آگے لائے، پھر پیچھے لے گئے،

(مسح) سر کے ابتدائی حصے سے شروع کیا، پھر دونوں ہاتھ گدی تک لے جا کر وہیں واپس لائے جہاں سے (مسح) شروع کیا تھا، پھر اپنے پیر دھوئے۔

۵۔عَنِ ابْنِ شَهَابٍ اَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَزِيْدَ اَخْبَرَهُ اللَّيْثِيَّ أَنَّ حُمْرَانَ مَوْلٰى عُثْمَانَ أَخْبَرَهُ أَنَّ عُثْمَانَ بْنَ عَفَّانَ دَعَا بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ فَغَسَلَ كَفَّيْهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ مَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُمْنٰى إِلَى الْمِرْفَقِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ يَدَهُ الْيُسْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ مَسَحَ بِرَأْسِهِ ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَهُ الْيُمْنٰى إِلَى الْكَعْبَيْنِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ ثُمَّ غَسَلَ الْيُسْرٰى مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ قَالَ: رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ قَالَ: رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوْئِيْ هٰذَا ثُمَّ قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيْهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ. (مسلم، رقم ۵۳۸)

ابن شہاب سے روایت ہے کہ عطاء بن یزید لیثی، عثمان (رضی اللہ عنہ) کے آزاد کردہ غلام حمران سے روایت کرتے ہیں کہ عثمان بن عفان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے وضو کا پانی طلب فرمایا اور وضو کیا۔ پس اپنی دونوں ہتھیلیوں کو تین بار دھویا، پھر کلی کی اور ناک صاف کیا، پھر اپنے چہرہ کو تین بار دھویا، پھر اپنے دائیں ہاتھ کو تین بار کہنی تک دھویا، پھر اسی طرح بائیں ہاتھ کو دھویا، پھر اپنے سر کا مسح کیا، پھر اپنے دائیں پاؤں کو ٹخنوں تک تین بار دھویا، پھر اسی طرح بائیں پاؤں کو دھویا، پھر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا اور پھر فرمایا کہ جس نے میرے اس وضو کی طرح وضو کیا، پھر وہ کھڑا ہوا اور دو رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ ان میں اس نے اپنے دل کی باتیں نہ کیں تو اس کے گذشتہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

۶۔عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ زَیْدِ ابْنِ عَاصِمٍ الْأَنْصَارِیِّ۔ وَکَانَتْ لَہُ صُحْبَۃٌ۔ قَالَ: قِیْلَ لَہُ تَوَضَّأْ لَنَا وُضُوْءَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَدَعَا بِإِنَاءٍ فَأَکْفَأَ مِنْھَا عَلٰی یَدَیْہِ فَغَسَلَھُمَا ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ یَدَہُ فَاسْتَخْرَجَھَا فَمَضْمَضَ وَاسْتَنْشَقَ مِنْ کَفٍّ وَاحِدَۃٍ فَفَعَلَ ذٰلِکَ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ یَدَہُ فَاسْتَخْرَجَھَا فَغَسَلَ وَجْھَہُ ثَلَاثًا، ثُمَّ أَدْخَلَ یَدَہُ فَاسْتَخْرَجَھَا فَغَسَلَ یَدَیْہِ إِلَی الْمِرْفَقَیْنِ مَرَّتَیْنِ مَرَّتَیْنِ، ثُمَّ أَدْخَلَ یَدَہُ فَاسْتَخْرَجَھَا فَمَسَحَ بِرَأْسِہِ فَأَقْبَلَ بِیَدَیْہِ وَأَدْبَرَ، ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَیْہِ إِلَی الْکَعْبَیْنِ، ثُمَّ قَالَ: ھٰکَذَا کَانَ وُضُوْءُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ. (مسلم، رقم ۵۵۵)

حضرت عبداللہ بن زید بن عاصم انصاری صحابی رسول (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ان سے کسی نے عرض کیا کہ ہمارے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کی طرح وضو کرو، انھوں نے پانی کا برتن منگوایا اور برتن کو جھکا کر اس سے پانی اپنے دونوں ہاتھوں پر ڈالا اور ان کو تین بار دھویا، پھر پانی نکالا اور ایک ہی چلو سے کلی بھی کی اور ناک میں پانی بھی ڈالا اور ناک صاف کیا، اسی طرح تین بار کیا، پھر پانی لیا اور اپنے چہرہ کو تین بار دھویا، پھر پانی لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دو دو مرتبہ دھویا، پھر برتن سے ہاتھ تر کر کے سر کا مسح کیا اس طرح کہ دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کو لے گئے اور پھر پیچھے سے آگے کو لائے، پھر دونوں پاؤں ٹخنوں سمیت دھوئے، پھر فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وضو اسی طرح ہوا کرتا تھا۔

وضو کے اعضا دھونے میں گنجایش

۷۔عَنِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: تَوَضَّأَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّۃً مَرَّۃً.

(بخاری، رقم ۱۵۷)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں ہر عضو کو ایک ایک مرتبہ (بھی) دھویا۔

۸۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ زَيْدٍ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَوَضَّأَ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ. (بخاری، رقم ۱۵۸)

حضرت عبداللہ بن زید (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو میں اعضا کو دو دو بار (بھی) دھویا۔

وضو کرنے اور اُس کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنے کی فضیلت

۹۔ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ: كَانَتْ عَلَيْنَا رِعَايَةُ الْإِبِلِ فَجَاءَتْ نَوْبَتِي فَرَوَّحْتُهَا بِعَشِيٍّ فَأَدْرَكْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَائِمًا يُحَدِّثُ النَّاسَ فَأَدْرَكْتُ مِنْ قَوْلِهِ مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَتَوَضَّأُ فَيُحْسِنُ وُضُوءَهُ ثُمَّ يَقُومُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ مُقْبِلٌ عَلَيْهِمَا بِقَلْبِهِ وَوَجْهِهِ إِلَّا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ قَالَ: فَقُلْتُ: مَا أَجْوَدَ هٰذِهِ فَإِذَا قَائِلٌ بَيْنَ يَدَيَّ يَقُولُ الَّتِي قَبْلَهَا أَجْوَدُ فَنَظَرْتُ فَإِذَا عُمَرُ، قَالَ: إِنِّي قَدْ رَأَيْتُكَ جِئْتَ آنِفًا قَالَ: مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ يَتَوَضَّأُ فَيُبْلِغُ أو فَيُسْبِغُ الْوَضُوءَ ثُمَّ يَقُولُ: أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ الْجَنَّةِ الثَّمَانِيَةُ يَدْخُلُ مِنْ أَيِّهَا شَاءَ. (مسلم، رقم ۵۵۳-۵۵۴)

حضرت عقبہ بن عامر (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ ہماری یہ ذمہ داری ہوا کرتی تھی کہ باری باری اونٹ چرانے جائیں، چنانچہ ایک دن اپنی باری پر جب میں اونٹ چرا کر شام کو واپس آ رہا تھا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو لوگوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے پایا، ان باتوں میں سے میں نے بھی آپ کی یہ بات سن لی کہ جو مسلمان اچھی طرح وضو کرے، پھر کھڑا ہو اور پوری یک سوئی کے ساتھ دو رکعات نماز ادا کرے، تو اس کے لیے جنت واجب ہو جاتی ہے، میں نے کہا کہ یہ کلام کیسا عمدہ و اعلیٰ ہے، تو اچانک میرے آگے سے ایک کہنے والے نے کہا کہ اس سے پہلے جو بات ہوئی ہے، وہ اس سے بھی اچھی اور عمدہ تھی، میں نے دیکھا تو وہ عمر (رضی اللہ عنہ) تھے تو انھوں نے کہا کہ میں نے دیکھا ہے کہ تم ابھی ابھی آئے ہو، پھر یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص بہت اچھی طرح سے وضو کرے اور پھر 'أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ' کہے تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں تا کہ وہ ان میں سے جس دروازے سے چاہے، داخل ہو جائے۔

نماز کے علاوہ بعض مواقع پر وضو کی ترغیب

۱۰۔ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَتَيْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰى شِقِّكَ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قُلْ أَللّٰهُمَّ أَسْلَمْتُ وَجْهِي إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِي إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِي إِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجٰى مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ أَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِي أَرْسَلْتَ فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ فَأَنْتَ عَلَى الْفِطْرَةِ وَاجْعَلْهُنَّ آخِرَ مَا تَتَكَلَّمُ بِهِ قَالَ: فَرَدَّدْتُهَا على النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا بَلَغْتُ أَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِي أَنْزَلْتَ قُلْتُ:

وَ رَسُوْلِكَ قَالَ: لَا وَ نَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ. (بخاری، رقم ۲۴۷)

براء بن عازب (رضی اللہ عنہ) کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم اپنے بستر پر سونے کے لیے آؤ تو پہلے اس طرح وضو کرلو، جس طرح نماز کے لیے کرتے ہو، پھر داہنی کروٹ پر لیٹ کر یوں کہو، اے اللہ، میں نے اپنا چہرہ تیری طرف جھکا دیا۔ اپنا معاملہ تیرے ہی سپرد کر دیا۔ میں نے تیرے ثواب کی توقع اور تیرے عذاب کے ڈر سے تجھے ہی پشت پناہ بنا لیا۔ تیرے سوا کہیں پناہ اور نجات کی جگہ نہیں۔ اے اللہ، جو کتاب تو نے نازل کی، میں اس پر ایمان لایا، جو نبی تو نے رسول بنا کر بھیجا، میں اس پر ایمان لایا۔ پھر اگر تم اس حالت میں اسی رات مر گئے تو فطرت پر مرو گے اور اس دعا کو سب باتوں کے اخیر میں پڑھنا۔ کہتے ہیں: میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ الفاظ دوبارہ دہرائے۔ جب میں 'أَللّٰهُمَّ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ' پر پہنچا تو میں نے 'وَ رَسُوْلِكَ' کے الفاظ کہے، تو آپ نے ارشاد فرمایا: یہ نہ کہو، بلکہ 'وَ نَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ' کہو۔

۱۱۔ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا أَخَذْتَ مَضْجَعَكَ فَتَوَضَّأْ وُضُوْءَكَ لِلصَّلٰوةِ ثُمَّ اضْطَجِعْ عَلٰی شِقِّكَ الْأَيْمَنِ ثُمَّ قُلْ اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْلَمْتُ وَجْهِیْ إِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ أَمْرِیْ إِلَيْكَ وَأَلْجَأْتُ ظَهْرِیْ إِلَيْكَ رَغْبَةً وَرَهْبَةً إِلَيْكَ لَا مَلْجَأً وَلَا مَنْجَا مِنْكَ إِلَّا إِلَيْكَ آمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِیْ أَنْزَلْتَ وَبِنَبِيِّكَ الَّذِیْ أَرْسَلْتَ وَاجْعَلْهُنَّ مِنْ آخِرِ كَلَامِكَ فَإِنْ مُتَّ مِنْ لَيْلَتِكَ مُتَّ وَأَنْتَ عَلَی الْفِطْرَةِ. (مسلم، رقم ۶۸۸۲)

حضرت براء بن عازب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم اپنے بستر پر جانے کا ارادہ کرو تو نماز کے وضو کی طرح وضو کرو، اپنی دائیں کروٹ پر لیٹو، پھر پڑھو، اے اللہ میں نے اپنا چہرہ تیرے سپرد کر دیا اور میں نے اپنا معاملہ تیرے حوالہ کیا اور تیرے

ساتھ ٹیک لگا لی اور تیرا خوف کھاتے ہوئے تیری طرف رغبت کی، تیرے سوا کوئی پناہ اور نجات کی جگہ نہیں ہے، میں تیری اس کتاب پر ایمان لایا جسے تو نے نازل کیا اور تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا جنھیں تو نے رسول بنا کر بھیجا ہے۔ تم سونے سے پہلے ان کلمات کو اپنا آخری کلام بناؤ۔ پھر اگر تم اسی رات میں فوت ہو گئے تو فطرت پر فوت ہوئے۔

۱۲۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّنَامَ وَهُوَ جُنُبٌ غَسَلَ فَرْجَهُ وَتَوَضَّأَ لِلصَّلٰوةِ. (بخاری، رقم ۲۸۸)

حضرت عائشہ (رضی اللہ عنہا) سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب جنابت کی حالت ہی میں سونے کا ارادہ کرتے تو پہلے شرم گاہ کو دھو لیتے اور نماز کی طرح کا وضو کر لیتے تھے۔

۱۳۔ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ إِذَا أَرَادَ أَنْ يَّنَامَ وَهُوَ جُنُبٌ تَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلٰوةِ قَبْلَ أَنْ يَّنَامَ. (مسلم، رقم ۶۹۹)

حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنبی ہونے کی حالت میں سونے کا ارادہ فرماتے تو سونے سے پہلے نماز کی طرح کا وضو کر لیتے تھے۔

۱۴۔ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا كَانَ جُنُبًا فَأَرَادَ أَنْ يَّأْكُلَ أَوْ يَنَامَ تَوَضَّأَ وُضُوءَهُ لِلصَّلٰوةِ. (مسلم، رقم ۷۰۰)

حضرت عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب جنبی ہوتے اور کھانے یا سونے کا ارادہ فرماتے تو آپ نماز کی طرح کا وضو کر لیتے تھے۔

۱۵۔ عَنْ أَبِي سَعِيْدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ: إِذَا أَتٰى أَحَدُكُمْ أَهْلَهُ ثُمَّ أَرَادَ أَنْ يَّعُوْدَ فَلْيَتَوَضَّأْ. (مسلم، رقم ۷۰۷)

حضرت ابوسعید خدری (رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کرے اور پھر دوبارہ اس کا ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ وضو کر لے۔

وضو کی فضیلت

۱۶۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ الصُّنَابِحِيِّ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰه صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِذَا تَوَضَّأَ الْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ فَتَمَضْمَضَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ فِيْهِ وَإِذَا اسْتَنْثَرَ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ أَنْفِهِ فَإِذَا غَسَلَ وَجْهَهُ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ وَجْهِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَشْفَارِ عَيْنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ يَدَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ يَدَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ يَدَيْهِ فَإِذَا مَسَحَ بِرَأْسِهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رَأْسِهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ أُذُنَيْهِ فَإِذَا غَسَلَ رِجْلَيْهِ خَرَجَتِ الْخَطَايَا مِنْ رِجْلَيْهِ حَتّٰى تَخْرُجَ مِنْ تَحْتِ أَظْفَارِ رِجْلَيْهِ قَالَ: ثُمَّ كَانَ مَشْيُهُ إِلَى الْمَسْجِدِ وَصَلٰوتُهُ نَافِلَةً لَّهُ. (موطا، رقم ۶۷)

حضرت عبداللہ صنابحی (رضی اللہ عنہ) کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندۂ مومن جب وضو کرتا اور اس میں کلی کرتا ہے تو اس کے منہ کے گناہ جھڑ جاتے ہیں؛ اور جب ناک میں پانی ڈال کر اسے جھاڑتا ہے تو اس کے ناک کے گناہ جھڑ جاتے ہیں؛ اور جب چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ پلکوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب دونوں ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب اپنے سر کا مسح کرتا ہے تو اس کے سر کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس

کے کانوں سے بھی نکل جاتے ہیں؛ اور جب اپنے پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں کے گناہ جھڑ جاتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے ناخنوں کے نیچے سے بھی نکل جاتے ہیں۔ فرمایا: پھر اس کا مسجد جانا اور نماز پڑھنا اس پر مزید ہوتا ہے۔

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ

حضرت جعفر بن ابو طالب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا ابوطالب (اصل نام: عبد مناف بن عبدالمطلب بن ہاشم) کے بیٹے تھے۔ فاطمہ بنت اسد بن ہاشم ان کی والدہ تھیں، ہاشم، جعفر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا ہونے کے ساتھ جعفر کے نانا بھی تھے۔ حضرت علی اور عقیل ان کے سگے بھائی تھے۔ حضرت علی ان سے دس برس چھوٹے تھے، عقیل بن ابوطالب جعفر سے دس سال اور طالب بیس سال بڑے تھے۔ حضرت جعفر کی کنیت ابوعبداللہ تھی۔

مکہ میں ایک بار شدید قحط پڑا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا عباس بن عبدالمطلب اس وقت بھی بہت خوش حال تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے اور فرمایا، آپ کے بھائی ابوطالب کثیر العیال ہیں، اس قحط میں ہم ان کا بوجھ بانٹ لیتے ہیں۔ ایک بیٹا میں لے لیتا ہوں، ایک آپ لے لیں اور ہم ان کی پرورش کر دیتے ہیں۔ انھوں نے اس تجویز سے اتفاق کر لیا۔ ابوطالب سے بات ہوئی تو انھوں نے کہا، عقیل اور طالب کو میرے پاس رہنے دو۔ تب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدنا علی کو اور عباس نے حضرت جعفر کو اپنی پرورش میں لے لیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے تک جعفر عباس ہی کے پاس رہے۔

حضرت جعفر ''السابقون الاولون'' میں شامل تھے، (۶۱۳ء میں) دعوت حق پر لبیک کہنے والوں کی تعداد پچیس (یا اکتیس) ہو چکی تھی کہ انھوں نے اسلام قبول کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابھی دار ارقم میں منتقل ہو کر دعوت دین کا کام شروع نہ کیا تھا۔

ایک بار ابوطالب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کو نماز پڑھتے دیکھا، سیدنا علی آپ کے دائیں طرف تھے۔

انھوں نے جعفر سے کہا، اپنے تایازاد کے ساتھ نماز پڑھو، اس کے بائیں طرف کھڑے ہو جاؤ۔

حضرت جعفر بن ابوطالب کو حبشہ و مدینہ دونوں ہجرتوں کا شرف حاصل ہوا۔ رجب ۵ نبوی (۶۱۵ء) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی ایذا رسانیوں کو دیکھ کر صحابہ کو مشورہ دیا کہ حبشہ (Abyssinia, Ethiopia) کو ہجرت کر جائیں۔ فرمایا، وہاں ایسا بادشاہ (King of Axum) حکمران ہے جس کی سلطنت میں ظلم نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ سب سے پہلے عثمان بن عفان، ابوحذیفہ بن عتبہ، زبیر بن عوام، عبدالرحمان بن عوف، مصعب بن عمیر، عثمان بن مظعون، عامر بن ربیعہ، ابوسبرہ، سہیل بن بیضا اور ابوسلمہ اپنے گھر والوں کو لے کر (کل تعداد پندرہ) روانہ ہوئے۔ اسے ہجرت اولیٰ کہا جاتا ہے۔ چند ماہ کے بعد دو کشتیوں پر سوار ۶۷ اہل ایمان کا دوسرا گروپ نکلا جس کی قیادت حضرت جعفر بن ابوطالب نے کی۔ کچھ لوگ اسے ہجرت ثانیہ کہتے ہیں، لیکن اصل میں یہ پہلی ہجرت ہی کا دوسرا مرحلہ تھا۔ دونوں گروپوں کے مہاجرین کی مجموعی تعداد تراسی ہوگئی۔ نجاشی اور اس کے مصاحبین حضرت جعفر کے ہاتھ پر ایمان لائے۔ انھوں نے امہری زبان (Amharic) میں مہارت حاصل کر لی اور نجاشی کے ترجمان کا کام بھی کرتے رہے۔

مشرکین مکہ کو علم ہوا کہ مہاجرین حبشہ میں اطمینان و سکون کی زندگی گزار رہے ہیں تو انھوں نے باہمی مشورہ سے عبداللہ بن ابوربیعہ (یا عمارہ بن ولید) اور عمرو بن عاص کو بھیجا۔ نجاشی اور حبشہ کے تمام جرنیلوں اور مذہبی پیشواؤں کے لیے الگ الگ تحائف لے کر دونوں مکہ سے روانہ ہوئے۔ تب مکہ کا چمڑا بہت قیمتی سمجھا جاتا تھا، انھوں نے بہت سا چمڑا اکٹھا کیا۔ ہر وزیر اور پیشوا کو تحفہ نذر کیا اور کہا، ہمارے کچھ نادان نوجوانوں نے تمھارے ملک میں پناہ لے لی ہے۔ اپنی قوم کا دین چھوڑ دیا ہے اور تمھارے دین کو بھی اختیار نہیں کیا۔ سرداران قوم نے انھیں واپس لے جانے کے لیے ہمیں ذمہ داری دی ہے، ہم شاہ حبشہ سے یہ درخواست کریں گے تو ہماری تائید کرنا۔ آخر میں وہ نجاشی کے پاس پہنچے، اسے سجدہ کیا، عمرو اس کے دائیں اور عمارہ بائیں طرف بیٹھ گیا اور اپنی بات دہرائی۔ درباریوں نے ان کا مطالبہ مان لینے کا مشورہ دیا تو نجاشی غصے میں آ گیا اور کہا، چند افراد نے تمام ہمسایہ قوتوں کو نظر انداز کر کے میرے پاس پناہ لی ہے۔ میں ان کو بات کرنے کا موقع دیے بغیر کسی کے حوالے نہ کروں گا۔ چنانچہ مہاجرین کو دربار میں بلایا۔ حضرت جعفر بن ابوطالب نے اپنے ساتھیوں سے کہا، تم میں سے کوئی نہ بولے، آج میں گفتگو کروں گا۔ انھوں نے بادشاہ کو سلام کرنے پر اکتفا کیا۔ اہل دربار نے سجدہ نہ کرنے پر اعتراض کیا تو حضرت جعفر نے کہا، ہم صرف اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں پھر یہ گفتگو کی:

''اے بادشاہ! ہم جاہلیت کی زندگی گزار رہے تھے، بتوں کی پوجا کرتے، مردار کھاتے، بے حیائی کے کام

کرتے، رشتے ناتے توڑتے، پڑوسیوں سے برا سلوک کرتے اور ہمارا طاقت ور کم زور کو کھا جاتا تھا۔ان حالات میں اللہ نے ہمارے اندر ہی سے ایک رسول مبعوث کیا جس کی سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی تھی اور ان کا نام احمد بتایا تھا۔ہم ان کے حسب ونسب، سچائی، امانت داری اور پاک دامنی سے خوب واقف تھے۔انھوں نے ہمیں دعوت دی کہ اللہ کو ایک جانیں، اسی کی عبادت کریں اور ان بتوں سے بیزاری کا اظہار کر دیں جن کی ہم اور ہمارے باپ دادا پوجا کرتے آئے تھے۔صدق وامانت، صلۂ رحمی، پڑوسیوں سے حسن سلوک، حرام کاموں، قتل و خون ریزی، فحش باتوں، جھوٹ بولنے، یتیم کا مال کھانے اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے منع کیا۔اس رسول اللہ نے ہمیں خداے واحد کی بندگی کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کرنے کا حکم دیا۔انھوں نے ہمیں نماز پڑھنے، زکوٰۃ ادا کرنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔ہم نے ان کی تصدیق کی، ایمان لائے اور ان کے احکام کی پیروی کی تو قوم نے ہم پر زیادتیاں کرنا شروع کر دیں۔ہمیں طرح طرح کی ایذائیں پہنچا کر بتوں کی پوجا کی طرف واپس لوٹانا چاہا۔تب ہم نے آپ کے ملک میں پناہ لی۔دوسروں کے بجاے آپ کو ترجیح دی، اس امید میں کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہ ہوگا۔''

نجاشی نے پوچھا، کیا تمھیں اس رسول اللہ کے لائے ہوئے کلام الٰہی میں سے کچھ یاد ہے؟ جعفر نے کہا، ہاں۔اس نے تلاوت کرنے کو کہا تو سیدنا جعفر نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات سنائیں:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ، کٓھٰیٰعٓصٓ ذِکۡرُ رَحۡمَتِ رَبِّکَ عَبۡدَہٗ زَکَرِیَّا اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَآءً خَفِیًّا. (۱-۳)

''اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان، ہمیشہ رحم کرنے والا ہے۔کھٰیٰعص۔یہ تمھارے رب کی اپنے بندے زکریا پر مہربانی کا بیان ہے۔جب انھوں نے اپنے پروردگار کو پست آواز میں پکارا۔''

نجاشی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے حتیٰ کہ ڈاڑھی تر بتر ہوگئی، دربار میں موجود پادریوں کے گریہ سے ان کے مصحف بھیگ گئے: 'تَرٰٓی اَعۡیُنَھُمۡ تَفِیۡضُ مِنَ الدَّمۡعِ مِمَّا عَرَفُوۡا مِنَ الۡحَقِّ'، ''تم دیکھتے ہو کہ حق کو پہچان لینے کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔'' (سورۂ مائدہ:۸۳) کا فرمان الٰہی اس صورت حال پر خوب منطبق ہوتا ہے۔نجاشی بولا، یہ کلام اور موسیٰ علیہ السلام کا لایا ہوا کلام ایک ہی چراغ سے نکلی ہوئی روشنی ہیں۔میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے وہی رسول ہیں جن کا ذکر ہم انجیل میں پاتے ہیں اور جن کی بشارت عیسیٰ علیہ السلام نے دی۔اگر میں بادشاہت کا اسیر نہ ہوتا تو ان کی جوتیاں اٹھاتا۔پھر قریش کے ایلچیوں سے پوچھا، کیا یہ تمھارے غلام ہیں؟ جواب ملا،نہیں۔کیا تمھارا کوئی قرض ان کے ذمہ ہے؟ جواب آیا،نہیں۔نجاشی نے کہا، چلے

جاؤ! میں انھیں کبھی تمھارے حوالے نہ کروں گا۔

نجاشی سے صریح انکار سننے کے باوجود عمرو بن عاص نہ ٹلا۔ اس نے کہا، کل میں بادشاہ سے ایسی بات کروں گا کہ مسلمانوں کی خوشیوں پر پانی پھر جائے گا۔ وہ پھر دربار میں پہنچ گیا اور کہا، یہ لوگ عیسیٰؑ بن مریم کے بارے میں بڑی غلط باتیں کرتے ہیں۔ نجاشی نے سیدنا جعفر کو بلا کر اس باب میں اسلام کا نقطۂ نظر دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا، عیسیٰؑ اللہ کا کلمہ اور اس کی روح ہیں، اللہ نے کنواری مریمؑ کی طرف اسے القا کیا، اس عفیفہ کو کسی بشر نے چھوا تھا نہ پہلے اس کا کوئی بچہ ہوا تھا۔ نجاشی نے ایک تنکا اٹھایا اور کہا، جو تم نے عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت بتائی، اس میں اس تنکے جتنا اضافہ بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر پادریوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ نجاشی نے کہا، چاہے تم ناک بھوں چڑھا لو۔ پھر سیدنا جعفر اور ان کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا، جاؤ! میرے ملک میں اطمینان و سکون سے رہو۔ جو تمھیں برا بھلا کہے گا، سزا جھیلے گا۔ اس نے قریش کے دیے ہوئے تحائف واپس کرنے کا حکم دیا اور کہا، ہمیں ان کی چنداں حاجت نہیں۔ (مسند احمد: ۴۴۰۰، ۲۲۴۹۸)

نجاشی کے مائل بہ اسلام ہونے کے بعد حبشہ کے ایک شخص نے اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ نجاشی نے مہاجرین کے لیے کشتیاں تیار کرائیں اور جعفر بن ابوطالب کو پیغام بھیجا، اگر باغیوں کے مقابلے میں مجھے شکست ہو گئی تو کشتیوں میں سوار ہو کر چلے جانا اور میں فتح یاب ہوا تو ٹھیرے رہنا۔ باغیوں نے اعتراض کیا، ہم عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مانتے ہیں اور تم ان کو بندہ کہتے ہو۔ نجاشی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا، میں انھیں عیسیٰؑ بن مریم کہتا ہوں۔ نجاشی نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پا لیا تو عبداللہ بن مسعود اور کچھ اصحاب مدینہ چلے گئے تاہم حضرت جعفر اور باقی مسلمان حبشہ میں مقیم رہے۔

۴ھ میں نواسۂ رسول حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی تو سیدنا علی نے ان کا نام اپنے بھائی کے نام پر جعفر رکھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بلا کر فرمایا، مجھے حکم ہوا ہے کہ اس نام کو بدل دوں چنانچہ حسین تجویز فرمایا۔ (مسند احمد، رقم ۱۳۷۰)

۷ھ میں عمرو بن امیہ ضمری حبشہ آئے تو وہاں موجود ابوسفیان کی بیٹی ام حبیبہ (رملہ بنت ابوسفیان) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے شادی کا پیغام دیا۔ وہ پہلے عبیداللہ بن جحش سے بیاہی ہوئی تھیں اور انھی کے ساتھ حبشہ آئی تھیں۔ عبیداللہ نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تو ان میں علیحدگی ہو گئی۔ نجاشی نے آپ کے وکیل کی حیثیت سے اپنی باندی ابرہہ کے ذریعے یہ پیغام ان تک پہنچایا۔ انھوں نے خالد بن سعید بن عاص کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ حضرت

جعفر بن ابوطالب اور دیگر مسلمان رسم نکاح میں شریک ہوئے۔ نجاشی نے خطبہ پڑھا اور چار سو دینار مہر ادا کیا۔ خالد نے جوابی خطبہ دیا، ایجاب وقبول کے بعد نجاشی نے حاضرین کی کھانے سے تواضع کی۔

۱۳ جون ۶۲۲ء (۲۶ صفر) میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ کو ہجرت کی۔ حضرت جعفر ابھی حبشہ ہی میں تھے کہ آپ نے سیدنا معاذ بن جبل کے ساتھ ان کی مواخات قائم فرمائی۔ ان کی مدینہ آمد کے بعد مواخات والی روایت درست معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ بدر کے دن آیت میراث نازل ہوئی اور مواخات کے احکام ختم ہو گئے۔ قیام حبشہ کے دوران میں ایک بار نجاشی نے حضرت جعفر اور دوسرے صحابہ کو ایک کمرے میں بلایا جہاں وہ بوسیدہ کپڑے پہنے مٹی پر بیٹھا تھا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر سیدنا جعفر خوف زدہ ہو گئے، اس ہیئت کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا، عیسیٰ علیہ السلام نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو کسی نعمت سے نوازے تو ان پر لازم ہے کہ تواضع اختیار کریں۔ میں نے تمھیں یہ خوش خبری سنانے کے لیے بلایا ہے کہ تمھاری سرزمین سے میرا ایک نمایندہ یہ اطلاع لے کر پہنچا ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں اپنے نبی کو نصرت سے نوازا اور اس کے دشمنوں کو ہلاک کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ جنگ بدر میں فلاں فلاں شخص مارا گیا ہے اور فلاں فلاں مسلمانوں کی قید میں آ گیا ہے۔

ایک روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ بدر کی غنیمتوں میں سے جعفر کا حصہ نکالا (مستدرک حاکم، رقم ۴۹۴۵) تاہم واقدی نے اس کی نفی کی ہے۔

(۶۲۶ء میں) ہجرت مدینہ کو سات برس بیت گئے تو سیدنا جعفر اور باقی مہاجرین نے یہ کہہ کر مدینہ جانے کی خواہش ظاہر کی کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم غالب آ گئے ہیں اور دشمن مارے جا چکے ہیں۔ نجاشی نے زادراہ اور سواریاں دے کر ان کو رخصت کیا۔ (المعجم الکبیر طبرانی، رقم ۱۴۷۸) عمرو بن امیہ ضمری مہاجرین حبشہ کو دو کشتیوں میں سوار کر کے لائے۔ عمرو کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نجاشی کے پاس اسی غرض سے بھیجا تھا۔ آپ نے نجاشی کے نام جو خط ان کو دیا تھا، اس کا متن ذیل میں درج ہے۔ ابن کثیر کہتے ہیں، یہ خط بادشاہوں اور سربراہان مملکت کو لکھے جانے والے خطوط کی ایک کڑی تھی۔ نجاشی پہلے ہی اسلام لا چکا تھا۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد رسول اللہ کی طرف سے نجاشی اصحم (یا اصحمہ) بن ابجر شاہ حبشہ کی طرف۔ تم پر سلام ہو۔ میں تمھاری طرف اللہ کی حمد بھیجتا ہوں جو حقیقی بادشاہ، ہر عیب سے پاک، سلامتی پہنچانے والا، امن دینے والا اور نگہبان ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہیں جو اس نے کنواری، پاکیزہ اور پاک دامن مریم کی طرف القا کیا تو وہ حاملہ ہوئی۔ سیدنا عیسیٰ کو اللہ نے اپنی روح اور اپنی پھونک سے تخلیق کیا جیسے آدم کو

اپنے ہاتھ اور اپنی پھونک سے پیدا کیا۔ میں تمھیں اللہ یکتا کی بندگی اور مسلسل اطاعت کی دعوت دیتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں۔ میری پیروی کرو اور میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لاؤ، کیونکہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ میں نے اپنے چچا زاد جعفر اور کچھ مسلمانوں کو تمھارے پاس بھیج رکھا ہے۔ اب تمھیں اور تمھاری فوجوں کو اللہ پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں نے بات پہنچا دی اور نصیحت کر دی۔ میری نصیحت قبول کرو۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔''

نجاشی نے اس خط کے جواب میں لکھا، ہم نے آپ کے چچا زاد اور صحابہ کی مہمان نوازی کی۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے اور تصدیق شدہ رسول ہیں اس لیے آپ کے چچا زاد جعفر کی بیعت کی اور اس کے ہاتھ پر اللہ رب العالمین پر ایمان لے آیا ہوں۔ میں نے اپنے بیٹے ارہا (ارمی) بن اصحم کو آپ کے پاس بھیجا ہے۔ آپ نے چاہا تو میں آپ کے پاس آؤں گا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ جو کہہ رہے ہیں حق ہے۔ ابن اسحاق کہتے ہیں، ارہا کی کشتی سمندر کے بیچ میں غرق ہو گئی اور اس میں سوار ساٹھ افراد لقمۂ اجل بن گئے۔

مہاجرین کی دونوں کشتیاں صحیح سلامت حجاز کے ساحل پر پہنچ گئیں پھر مہاجرین اونٹوں پر سوار ہو کر مدینہ پہنچے، جعفر بن ابو طالب کے ساتھ لوٹنے والوں میں شامل تھے، جعفر کی اہلیہ اسما بنت عمیس، ان کے بیٹے عبداللہ بن جعفر، خالد بن سعید بن عاص، ان کی اہلیہ امینہ (یا ہمینہ) بنت خلف، ان کے بیٹے سعید بن خالد اور بیٹی امہ بنت خالد، خالد کے بھائی عمرو بن سعید بن عاص، معیقیب بن ابو فاطمہ، ابو موسیٰ اشعری، اسود بن نوفل، جہم بن قیس اور ان کے بیٹے، عمرو بن جہم اور خزیمہ بن جہم، عامر بن ابو وقاص، عتبہ بن مسعود، حارث بن خالد، عثمان بن ربیعہ، محمیہ بن جز، معمر بن عبداللہ، ابو حاطب بن عمرو، مالک بن ربیعہ اور ان کی زوجہ عمرہ بنت سعدی اور حارث بن عبد قیس۔ ان کے علاوہ سرزمین حبشہ میں وفات پا جانے والے اہل ایمان کی بیوگان بھی کشتیوں میں سوار تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر سے فارغ ہو کر مدینہ لوٹے تو جعفر نے آپ کا استقبال کیا۔ آپ نے انھیں اپنے ساتھ چمٹا لیا، معانقہ کیا، آنکھوں کے درمیان پیشانی پر بوسہ لیا اور فرمایا، میں بہت خوش ہوں، معلوم نہیں، جعفر کے آنے سے یا خیبر فتح ہونے پر۔ (مستدرک حاکم، رقم ۴۹۴۱) آپ نے انھیں خیبر کی غنیمت سے حصہ دیا اور مسجد نبوی کے پہلو میں گھر بنانے کے لیے جگہ عنایت فرمائی۔ سیدنا جعفر نے وہ تحائف آپ کو پیش کیے جو نجاشی اور اس کے بھتیجے ذو مخمر نے بھیجے تھے۔

۷ھ ذی قعد کے مہینے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ عمرۂ قضا کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ اجح کے مقام پر پہنچ کر آپ نے جعفر بن ابو طالب کو بنو ہلال کی میمونہ بنت حارث کی طرف نکاح کا پیغام دے کر بھیجا۔ ان کی طرف

سے عباس بن عبدالمطلب کو وکیل مقرر کیا گیا جنھوں نے میمونہ کو آپ کی زوجیت میں دے دیا۔عمرہ سے واپسی پر سرف کے مقام پر آپ نے ولیمہ منعقد کیا۔ابن سعد کہتے ہیں، مدینہ سے چلنے سے پہلے ہی آپ اوس بن خولی اور ابورافع کو یہ پیغام دے کر عباس کی طرف بھیج چکے تھے۔

عمرۂ قضا ادا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ مکہ سے لوٹنے لگے تو سیدالشہدا حمزہ کی بیٹی عمارہ چچا چچا کرتے ہوئے آپ کے پیچھے لپکی۔سیدنا علی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر سیدہ فاطمہ سے کہا، اپنے چچا کی بیٹی سنبھال لو! مدینہ پہنچنے پر علی، زید اور جعفر میں جھگڑا ہو گیا۔سیدنا علی نے کہا، میں اس پر زیادہ حق رکھتا ہوں، یہ میرے چچا کی بیٹی ہے۔ان کے بھائی جعفر نے کہا، یہ میرے بھی چچا کی بیٹی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔زید بن حارثہ نے کہا، یہ میری بھتیجی ہے (جنگ احد میں حمزہ نے اپنی وصیت پوری کرنے کی ذمہ داری زید کو سونپی تھی اس لیے ان کا خیال تھا کہ وہ اس کی پرورش کا حق رکھتے ہیں)۔آپ نے یہ فرما کر کہ ''خالہ ماں ہی کی طرح ہوتی ہے''، بچی جعفر کے سپرد کر دی۔(یہ فیصلہ کرنے کے بعد آپ نے تینوں اصحاب کے لیے تسلی کے کلمات ارشاد فرمائے)۔حضرت علی سے فرمایا، ''تو مجھ سے ہے اور میں تجھ سے ہوں''۔جعفر سے کہا، ''تو جسمانی ساخت اور اخلاق میں مجھ سے مشابہت رکھتا ہے''۔زید سے ارشاد کیا، ''تو میرا بھائی اور میرا مولا ہے''۔(بخاری، رقم ۲۶۹۹، مسند احمد، رقم ۷۷۰) ابن سعد کی روایت کے مطابق بچی گھوم پھر رہی تھی کہ سیدنا علی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فاطمۃ الزہرا کے ہودے میں بٹھا دیا۔تب ان تین اصحاب میں نزاع ہوا۔ان کے شور سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہوئے اور فرمایا، ادھر آؤ! میں تمھارا جھگڑا نمٹاؤں۔بچی جعفر کو ملی تو وہ کھڑے ہو کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گھومنے لگے۔آپ نے پوچھا، یہ کیا؟ جعفر نے جواب دیا، میں نے حبشہ میں لوگوں کو بادشاہوں کے ساتھ ایسا کرتے دیکھا ہے۔اسما بنت عمیس جعفر کی اہلیہ اور بچی کی خالہ تھیں، اس کی والدہ کا نام سلمٰی بنت عمیس تھا۔

شاہ روم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تحفہ کے طور پر اطلس کا ایک چوغہ بھیجا۔آپ نے پہنا تو آپ کے ہاتھ اس (کی طویل آستینوں) میں اٹکنے لگے۔آپ نے اسے جعفر بن ابوطالب کے پاس بھیج دیا۔جعفر اسے پہن کر آئے تو فرمایا، میں نے تمھیں پہننے کے لیے نہیں دیا۔پوچھا، تو میں اس کا کیا کروں؟ فرمایا، اپنے بھائی نجاشی کو بھیج دو۔(ابو داؤد، رقم ۴۰۴۷، مسند احمد، رقم ۱۳۴۰۰) اس حدیث کے راوی علی بن جدعان کو ضعیف قرار دیا گیا ہے۔

۷ھ میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے قیصر روم ہرقل کو خط بھیج کر اسلام کی دعوت دی، اس نے درباریوں کے خوف سے اسلام قبول نہ کیا۔پھر آپ نے حارث بن عمیر کی سربراہی میں ایک وفد شاہ بُصریٰ کے نام خط دے کر

بھیجا۔ یہ وفد شام کے سرحدی علاقے بلقا کے مقام موتہ سے گزر رہا تھا کہ وہاں کے حاکم شرحبیل بن عمرو غسانی نے حارث کا گلا گھونٹا اور باقی ارکان کو شہید کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ایلچی کی جان لینے کا یہ ایک ہی واقعہ ہوا۔ آپ نے شہدا کا بدلہ لینا اور شرحبیل کی تادیب کرنا ضروری سمجھا۔ عمرۂ قضا ادا کر کے آپ ذی الحجہ ۷ھ میں مدینہ پہنچے اور دو ماہ کے توقف سے جمادی الاولیٰ ۸ھ (۶۲۹ء) میں تین ہزار کا لشکر تیار کر کے زید بن حارثہ کو اس کا امیر مقرر کیا۔ خود جرف کے معسکر تشریف لے گئے اور لشکر کو روانہ فرمایا، زید کو سفید علم عطا کیا اور دعاے خیر و برکت کر کے فرمایا: ''اگر زید شہید ہوئے تو جعفر بن ابوطالب امیر ہوں گے، اگر جعفر شہادت پا گئے تو عبداللہ بن رواحہ ان کی جگہ لیں گے۔ وہ بھی شہادت سے سرفراز ہوئے تو مسلمان باہمی رضامندی سے اپنا امیر چن لیں'' (بخاری، رقم ۴۲۶۱) جعفر نے اچھل کر کہا، یا رسول اللہ! مجھے خیال نہ تھا کہ آپ زید بن حارثہ کو مجھ پر امیر بنائیں گے۔ آپ نے فرمایا، چلے چلو! تمھیں نہیں معلوم، کیا چیز بہتر ہے؟ (مسند احمد، رقم ۲۲۵۵۱) ثنیۃ الوداع کے مقام پر آپ نے لشکر کو الوداع کہا۔ ایک یہودی نعمان بن فنحص اس وقت موجود تھا۔ اس نے زید سے کہا، اگر محمد نبی ہیں تو تم ہرگز زندہ نہ لوٹو گے، کیونکہ بنی اسرائیل کے نبی اس طرح جب کسی کا نام لے لیتے تھے تو وہ ضرور شہید ہو جاتا تھا۔

شرحبیل کو جیش اسلامی کی روانگی کی خبر ملی تو اس نے مقابلے کے لیے دو لاکھ سپاہیوں (دوسری روایت: ایک لاکھ) پر مشتمل بڑی فوج تیار کی۔ بحیرۂ مردار کے ساحل پر، دریاے اردن کے مغربی کنارے سرزمین بلقا (موجودہ کرک) میں مشارف کے مقام پر دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ زید نے چھ دن تک ضرب و فرار (hit and run) کی اسٹریٹیجی سے کام لیا۔ کبھی ایک مقام پر، کبھی دوسری جگہ سے، کبھی سامنے سے، کبھی پہلو سے آتے، دشمن کو جوابی کارروائی کرنے کا موقع نہ دیتے اور صحرا میں غائب ہو جاتے۔ ساتویں دن وہ سامنے (front) سے نمودار ہوئے، جوں ہی رومی فوج کے پرے بڑھنے لگے، انھوں نے پسپائی اختیار کر لی۔ رومی فوج نے ان کا پیچھا کیا، لیکن دو لاکھ کی فوج عجلت میں اپنی ترتیب قائم نہ رکھ سکی۔ موتہ کے مقام پر زید نے پلٹ کر بھرپور حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سو صفوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا حصہ ان کا ہدف بنا جو حملے کی تاب نہ لا سکا۔ رومیوں نے راہ فرار پکڑی اور اپنے لشکر ہی کو روندتے ہوئے کھلے میدان کی طرف بھاگے۔ مسلمان سپاہی ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ اسی اثنا میں زید بن حارثہ پر چاروں طرف سے وار ہو رہے تھے، زیادہ خون بہہ جانے سے وہ گھوڑے سے گر پڑے اور جام شہادت نوش کیا۔ فرمان نبوی کے مطابق جعفر بن ابوطالب فوراً آگے بڑھے، اپنے سرخ گھوڑے سے اترے، اسے ذبح کیا، اسلحہ ہلکا کیا اور علم تھام کر پیادہ ہی لڑنا شروع کر دیا۔ اسلامی تاریخ میں اپنے گھوڑے کو ذبح کر کے جنگ میں کود جانے کی یہ

اولین مثال تھی۔ابن کثیر کہتے ہیں، ایسا انھوں نے اس لیے کیا کہ گھوڑا دشمن کے ہاتھ نہ لگ جائے۔انھوں نے نوے (بخاری، رقم ۴۲۶۰: پچاس) سے زائد زخم کھائے، پہلے ان کا دایاں بازو کٹا، انھوں نے علم بائیں ہاتھ میں تھام لیا پھر بایاں بازو کٹا، انھوں نے کٹے ہوئے بازووں سے اسے سہار لیا اور آخری دم تک جان فشانی سے لڑتے رہے۔اسی لیے انھیں ذوالجناحین (دو پروں والا، یہ پر جنت میں عطا ہوں گے) کا لقب ملا۔(مستدرک حاکم، رقم ۴۹۳۷) ایک عینی شاہد کا کہنا ہے، جعفر کے جسم میں نیزہ آکر کھبا تو وہ اسی طرح چلتے ہوئے دشمنوں کے ایک فوجی سے جا ٹکرائے۔ نیزہ اس کے جسم سے پار ہوا تو بیک وقت دونوں موت سے ہم کنار ہوئے۔عباد اپنے رضاعی باپ سے روایت کرتے ہیں جو جنگ موتہ میں شریک تھے، میں نے جعفر کو شہادت سے پہلے یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا:

یاحبذا الجنة واقترابها　　طيبة و باردا شرابها

والروم روم قد دنا عذابها　　كافرة بعيدة انسابها

عليّ ان لاقيتها ضرابها

(کیا ہی خوش گوار ہے جنت اور اس کا قریب آنا جس کا حال یہ ہے کہ وہ پاک ہے اور اس کی شراب ٹھنڈی ہے۔رومی، رومیوں کا انجام قریب آ گیا ہے، کافر اور دور کا نسب رکھنے والے ہیں۔مجھ پر لازم ہے، ان کا سامنا ہو تو خوب تلوار زنی کروں۔)

عبداللہ بن رواحہ بھی جان فشانی سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے تو خالد بن ولید نے علم تھاما اور ایک دن مزید جنگ کرنے کے بعد لشکر کو بحفاظت مدینہ واپس لے آئے۔عبداللہ بن عمر کہتے ہیں، میں جنگ موتہ میں شریک تھا، ہم نے جعفر بن ابوطالب کو ڈھونڈا، وہ شہدا میں تھے۔ہم نے ان کے جسم پر تلواروں اور نیزوں سے لگے ہوئے نوے (یا پچاس) سے زائد زخم شمار کیے۔ان میں سے ایک بھی پشت پر نہ تھا۔(بخاری، رقم ۴۲۶۰، ۴۲۶۱) ایک روایت ہے کہ ایک رومی نے تلوار کا وار کر کے ان کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے۔(مستدرک حاکم، رقم ۴۹۳۱) جعفر نے اکتالیس (ابن ہشام: تینتیس) برس کی عمر پائی۔انھیں ثنیۃ الکرک کے مقام پر دفن کیا گیا۔

مدینہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو شہداے جنگ موتہ کی اطلاع ملی تو منبر پر تشریف لائے اور الصلاۃ جامعۃ کی پکار لگانے کا حکم دیا۔لوگ اکٹھے ہو گئے تو فرمایا، میں تمھیں غزوۂ موتہ کے لشکر کی خبر دینے لگا ہوں۔دشمن سے ان کا مقابلہ ہوا، ''علم زید نے تھاما اور شہید ہو گئے پھر جعفر نے پکڑا اور شہادت پائی۔اس کے بعد یہ ابن رواحہ کے ہاتھ آیا، انھوں نے بھی جام شہادت نوش کیا، آخر کار علم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار (خالد) نے امیر نہ ہوتے ہوئے بھی پکڑ لیا اور اللہ نے انھیں فتح دی۔'' یہ بیان کرتے ہوئے آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔آپ نے زید، جعفر

اور ابن رواحہ کے لیے دعاے مغفرت فرمائی۔(بخاری، رقم ۱۲۴۶، ۳۷۵۷، مسند احمد، رقم ۲۲۵۶۶) انس بن مالک کی روایت کے مطابق آپ کا ان شہدا کے آخری حالات بیان کرنا امور غیبیہ میں سے تھا، باقاعدہ اطلاع آنے سے پہلے ہی آپ نے اہل ایمان کو یہ سب بتا دیا۔(بخاری، رقم ۳۶۳۰، نسائی، رقم ۱۸۷۹) آپ نے روتے ہوئے یہ بھی فرمایا، وہ میرے بھائی، مجھ سے انس رکھنے والے اور میری باتیں کرنے والے تھے۔ واقدی کی روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جعفر بن ابوطالب کے ہاتھ پر چم آیا تو شیطان ان کے پاس آیا اور زندگی کی محبت اور دنیا کی تمنا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے جواب دیا، اہل ایمان کے دلوں میں ایمان مستحکم ہو چکا ہے، اب دنیا کی رغبت دلا رہے ہو؟

آپ نے حضرت جعفر کی اہلیہ اسماء بنت عمیس سے الگ تعزیت کی۔ وہ بیان کرتی ہیں، میں نے چالیس کھالیں پکا کر تیار کیں، آٹا گوندھا اور بچوں کو نہلا دھلا کر تیل لگا کر فارغ ہوئی تھی۔ آپ نے فرمایا، اسما! جعفر کے بچے کہاں ہیں؟ میں انھیں لے کر آئی، آپ نے انھیں اس کیفیت میں پیار کیا کہ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں، کیا آپ کو جعفر کی کوئی خبر ملی ہے؟ فرمایا: ہاں، آج یہ لوگ شہید ہو گئے ہیں۔ میں چیخ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور عورتوں کو اکٹھا کرنے لگی تو آپ نے فرمایا: اسماء! واہی تباہی نہ بول اور سینہ مت پیٹ۔ پھر گھر تشریف لے گئے۔ فاطمہ ہائے چچا! کہہ کر روتی ہوئی آئیں تو آپ نے فرمایا، جعفر جیسوں ہی کے لیے رونے والیوں کو رونا چاہیے۔ آپ نے آل جعفر کے لیے کھانا پکانے کا حکم دیا اور فرمایا، آج وہ اپنا انتظام نہ کر سکیں گے۔(ترمذی، رقم ۹۹۸، مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۶) آپ بہت غم زدہ تھے کہ جبریل علیہ السلام آئے اور خبر دی کہ اللہ نے جعفر کو دو پر دیے ہیں جو خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ وہ ان کے ذریعے جبرئیل و میکائیل جیسے بڑے فرشتوں کے ساتھ اڑتے پھر رہے ہیں اور جنت کے پھلوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔(ترمذی، رقم ۳۷۶۳، مستدرک حاکم، رقم ۴۳۴۸، ۴۹۳۷)۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر بن ابوطالب کے گھر جانے میں تین دن کا توقف کیا۔ ان کے گھر پہنچے تو فرمایا، آج کے بعد میرے بھائی پر مت رونا۔ پھر فرمایا، میرے بھتیجوں کو لے آؤ۔ وہ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ آپ نے انھیں پیار کیا، ساتھ چمٹایا اور نائی کو بلا کر ان کے سر منڈائے پھر فرمایا، محمد بن جعفر ہمارے چچا ابوطالب سے مشابہت رکھتا ہے۔ عبداللہ بن جعفر کی جسمانی ساخت اور اس کے اخلاق مجھ سے ملتے جلتے ہیں۔ آپ نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑا، اسے بلند کیا اور تین بار دعا فرمائی، اے اللہ! تو جعفر کے اہل خانہ میں اس کا قائم مقام ہو جا، بہترین طریقے سے جس طرح تو اپنے نیک بندوں میں سے کسی کی جگہ پر کر دیتا ہے۔

عبداللہ کے ہاتھوں میں برکت ڈال دے۔ آپ نے اسما سے کہا، تو تنگ دستی سے ڈرتی ہے، میں دنیا و آخرت میں ان بچوں کا ولی ہوں، ان کے باپ کی جگہ ہوں۔ (ابوداؤد، رقم ۴۱۹۲، مسند احمد، رقم ۱۷۵۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر سے حاصل ہونے والے مال فے میں سے آل جعفر کے لیے پچاس وسق (ایک وسق: ساٹھ صاع، پچاس وسق: پچاس اونٹوں پر لادا جانے والا غلہ) سالانہ مقرر فرمائے۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں، جعفر، زید اور ابن رواحہ کی شہادت کی خبر آئی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، آپ کے چہرۂ مبارک پر غم کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ میں دروازے کی درز سے جھانک رہی تھی، ایک شخص آیا اور جعفر بن ابوطالب کے گھر کی عورتوں کے رونے دھونے کا ذکر کیا۔ آپ نے انھیں منع کرنے کا حکم دیا۔ وہ دوبارہ آیا اور بتایا، وہ کہا نہیں مان رہیں۔ آپ نے اسے پھر روکنے کو کہا۔ وہ تیسری دفعہ آیا اور کہا، ان عورتوں نے مجھے مغلوب کر دیا ہے۔ آپ نے فرمایا، (اگر وہ باز نہیں آتیں تو) ان کے مونہوں میں خاک ڈال دو۔ (بخاری، رقم ۱۲۹۹، مسلم، رقم ۲۱۱۷)

جعفر کی اہلیہ اسماء بنت عمیس خود روایت کرتی ہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تیسرے دن میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا: ''آج کے بعد سوگ نہ کرنا۔'' (مسند احمد، رقم ۲۷۰۸۳، ۲۷۴۶۸) مسند احمد کے اس متن میں جو حمزہ احمد زین نے مرتب کیا ہے، یہ حدیث یوں ہے، آپ نے اسماء سے فرمایا: ''تین دن سوگ کا لباس پہن لو پھر جو جی چاہے کرو۔'' (رقم ۲۷۳۴۱) ابن عربی کہتے ہیں، یہ حدیث باطل ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بیوہ کو آنکھ آنے پر بھی سرمہ لگانے کی اجازت نہیں دی۔ (ابن ماجہ، رقم ۲۰۸۴) یہ حدیث صحیح بھی ہوتی تو اتنا ثابت ہوتا کہ تین دن کے بعد بیوہ کو سوگ کا لباس اتار دینا چاہیے۔ ابن حزم اسے منقطع کہتے ہیں، طحاوی منسوخ قرار دیتے ہیں۔ ابن حجر بھی اس کو معمول بہ نہیں سمجھتے، کیونکہ اس کا متن دیگر احادیث صحیحہ کے خلاف ہے جن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیوہ کا سوگ چار ماہ دس دن قرار دیا ہے۔ تاہم وہ کہتے ہیں، یہ حدیث صحیح ہے اور اس کے منسوخ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ اسی حدیث کی بنیاد پر حسن بصری تین دن گزرنے کے بعد بیوہ کے لیے خوشبو لگانا اور زیب و زینت کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔

ہجرت حبشہ سے پہلے جعفر کی شادی بنوخثعم کی اسما بنت عمیس سے ہو چکی تھی۔ اسما ان کے ساتھ حبشہ گئیں، قیام حبشہ کے دوران میں ان کے تین بیٹے عبداللہ، محمد اور عون پیدا ہوئے۔ ان میں سے عبداللہ مشہور ہوئے جن کے نام پر جعفر کنیت کرتے تھے۔ جعفر کی شہادت کے بعد اسماء بنت عمیس کی شادی سیدنا ابوبکر سے ہوئی، ان سے محمد بن ابوبکر

پیدا ہوئے۔ سیدنا ابوبکر کی وفات کے بعد وہ سیدنا علی سے بیاہی گئیں اور یحییٰ بن علی نے جنم لیا۔ ایک بار اسما نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، جعفر کے لڑکوں کو نظر بہت جلد لگتی ہے، کیا میں ان کے لیے جھاڑ پھونک کروں؟ آپ نے فرمایا: ''ہاں! کیونکہ اگر کسی چیز کے تقدیر پر غلبہ پانے کا امکان ہوتا تو وہ نظر ہی ہوتی۔'' (ترمذی، رقم ۲۰۵۹، مسند احمد، رقم ۲۷۴۷۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جعفر کی اولاد سے شفقت برقرار رہی۔ عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سفر سے واپس آتے تو آپ کے گھرانے کے بچوں سے آپ کا استقبال کرایا جاتا۔ ایک بار آپ کسی غزوہ سے لوٹے تو مجھے لے جایا گیا۔ آپ نے مجھے آگے بٹھا لیا پھر سیدہ فاطمہ کے ایک بیٹے (حسن یا حسین) کو لایا گیا۔ آپ نے اسے اپنے پیچھے سوار کر لیا۔ ہم تینوں اسی طرح مدینہ میں داخل ہوئے۔ (مسلم، رقم ۶۳۴۹)

ابو طالب کی وفات ہوئی تو ان کی وراثت طالب اور عقیل کو مل گئی۔ تب عقیل نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ حضرت جعفر اور سیدنا علی کو کوئی حصہ نہ ملا، کیونکہ یہ اسلام لا چکے تھے۔ اسامہ بن زید نے فتح مکہ کے موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، کیا آپ اپنے مکہ کے گھر میں قیام کریں گے؟ یہ مکان اصل میں ابوطالب کا تھا، طالب اور عقیل کو ملا تو کسی مرحلے پر عقیل نے بیچ دیا۔ اسی لیے آپ نے فرمایا، کیا عقیل نے ہمارے لیے وہاں کوئی گھر چھوڑا بھی ہے؟ (مسلم، رقم ۳۲۸۱، ابن ماجہ، رقم ۲۷۳۰)

اسماء بنت عمیس کی حضرت علی سے شادی ہونے کے بعد ان کی موجودگی میں محمد بن جعفر اور محمد بن ابوبکر باہم مفاخرت کرنے لگے۔ دونوں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے، میں تم سے زیادہ عزت دار ہوں اور میرا باپ تمھارے باپ سے بہتر ہے۔ اسماء دونوں کی ماں تھیں، جعفر اور ابوبکر کے عقد میں رہنے کے بعد سیدنا علی کی زوجیت میں آئی تھیں اس لیے سیدنا علی نے ان سے کہا، ان کے بیچ فیصلہ کرو۔ اسما نے کہا، میں نے عربوں میں جعفر سے زیادہ اچھا جوان اور ابوبکر سے بہتر متوسط العمر نہیں دیکھا۔ سیدنا علی نے کہا، تم نے میرے لیے کوئی صفت نہیں چھوڑی۔ تب انھوں نے کہا، ان تینوں (جعفر، ابوبکر اور علی) میں سے کم ترین بھی بہترین ہے۔ سیدنا علی نے کہا، تم یہ بھی نہ کہتیں تو میں تم سے سخت ناراض ہوتا۔

عبداللہ بن عمر عبداللہ بن جعفر کو سلام کرتے تو یوں کہتے، 'السلام علیک یا ابن ذی الجناحین، تم پر سلامتی ہو، اے دو پروں والے کے بیٹے!'۔ (بخاری، رقم ۳۷۰۹) عبداللہ بن عباس کہتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، اسما بنت عمیس قریب بیٹھی ہوئی تھیں کہ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔ پھر فرمایا، ''جعفر بن

ابوطالب جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام کی معیت میں گزر رہے ہیں اور مجھے سلام کیا ہے۔ اسماء! تو بھی انھیں سلام کا جواب دے۔'' (مستدرک حاکم، رقم ۴۹۴۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مجھے جعفر، زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ اس طرح دکھائے گئے کہ موتیوں سے بنے ہوئے خیمے میں سونے کی چار پائیوں پر بیٹھے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ زید اور ابن رواحہ کی گردنوں میں کچھ کجی ہے جب کہ جعفر کی گردن سیدھی ہے اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہیں۔ میں نے پوچھا تو بتایا گیا، ان دونوں پر موت غلبہ پانے لگی تو انھوں نے رخ موڑ لیا، جبکہ جعفر نے ایسا نہیں کیا۔'' (الاستیعاب بروایت سعید بن مسیّب)

جعفر مسکینوں غریبوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھتے، ان سے باتیں کرتے، وہ انھیں اپنے حالات بتاتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انھیں ابوالمساکین کی کنیت سے پکارتے۔ (ترمذی، رقم ۳۷۶۶) سیدنا ابوہریرہ فرماتے ہیں، میں بھوک کی شدت کم کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیا کرتا تھا۔ اپنے پاس بیٹھے ہوئے صحابہ سے قرآن کی آیات سنتا اور ان کے بارے میں سوالات کرتا محض اس لیے کہ وہ مجھے لے جا کر کچھ کھلا پلا دیں۔ مسکینوں کے لیے سب سے بھلے جعفر بن ابوطالب تھے۔ ہمیں ساتھ لے جاتے اور گھر میں موجود کھانا کھلاتے۔ یہ بھی ہوا کہ وہ گھی کا خالی مشکیزہ اٹھا لائے اور ہم نے اسے پھاڑ کر اس میں چپکا ہوا گھی چاٹ لیا۔ (بخاری، رقم ۳۷۰۸) سیدنا ابوہریرہ فرماتے تھے، کوئی جوتی پہننے والا، سواری پر سوار ہونے والا اور اونٹ کے کجاوے میں بیٹھنے والا شخص ایسا نہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جعفر سے افضل ہو۔ (ترمذی، رقم ۳۷۶۴، مسند احمد، رقم ۹۳۵۳) محدثین کہتے ہیں، اس سے مراد سخاوت میں فضیلت رکھنا ہے، کیونکہ یہ ان کا خاص وصف تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ امت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین ہی کو سب سے زیادہ صاحب فضیلت سمجھتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جعفر سے فرمایا: ''تو جسم کی ساخت اور اخلاق و عادات میں مجھ سے ملتا جلتا ہے۔'' (بخاری، رقم ۴۲۵۱، مسند احمد، رقم ۸۵۷) ''تو مجھ سے اور میرے شجرہ سے ہے۔'' (مسند احمد، رقم ۲۱۷۷۷) سیدنا علی سے نقل کی جانے والی یہ روایت ضعیف اور منقطع ہے، ''مجھ سے پہلے ہر نبی کو سات معزز رفقا وزیر بنا کر دیے گئے تھے، جبکہ مجھے چودہ نقیبوں کی معیت حاصل ہے۔ ان کے نام یہ ہیں، حمزہ، جعفر، علی، حسن، حسین، ابوبکر، عمر، مقداد، عبداللہ بن مسعود، حذیفہ، سلمان، عمار، بلال اور ابوذر۔ (مسند احمد، رقم ۱۲۶۳)

عبداللہ بن جعفر کہتے ہیں، میں نے اپنے تایا علی سے کچھ مانگا اور انھوں نے نہ دیا تو میں نے اپنے والد جعفر کے حق کا واسطہ دیا تو انھوں نے میری مانگ اسی وقت پوری کر دی۔ (المعجم الکبیر طبرانی، رقم ۱۴۷۶)

جعفر بن ابو طالب نے براہ راست نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث روایت کی۔ان سے روایت کرنے والوں میں شامل ہیں،ان کے بیٹے عبداللہ بن جعفر،عبداللہ بن مسعود،ابوموسیٰ اشعری،عمرو بن عاص اور ام المومنین ام سلمہ۔ جعفر سے مروی ایک حدیث 'سنن نسائی' میں موجود ہے۔

جعفر بن ابو طالب دائیں ہاتھ میں انگوٹھی پہنتے تھے۔(المعجم الکبیر طبرانی،رقم ۱۴۵۸)

چین کے مسلمان دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے ہاں اسلام ۶۱۶ء یا ۶۱۷ء(۶ یا ۷ نبوی) میں آیا جب سعد بن ابی وقاص،جعفر بن ابو طالب اور جحش حبشہ (Abyssinia) سے کشتی پر سوار ہو کر چٹا گانگ،کمروپ اور منی پور کے راستے خوتان (تبت) پہنچے۔تاریخ اسلامی کے ماخذ جعفر کی اس مہم کے ذکر سے خالی ہیں۔سعد بن ابی وقاص بعد میں بھی دو مرتبہ آئے،انھیں تیسری دفعہ خلیفۂ سوم عثمان نے ۲۹ھ (۶۵۱ء) میں چینی شاہ یونگ وی (Yung-Wei) کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھیجا۔خوتان کے لوگ اپنا نسب بھی جعفر سے ملاتے ہیں۔

جعفر بن ابو طالب کا مقبرہ اردن کے ضلع کرک (Kerak) کی بستی مزار جنوبی میں ہے جو موجودہ دارالخلافہ عمان سے ۱۴۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔جعفر کے مزار کو داؤدی فرقہ کے ۵۲ ویں امام محمد برہان الدین نے سونے اور چاندی سے مزین کرایا۔

عبداللہ بن جعفر کی شادی زینب بنت علی سے ہوئی۔عون بن جعفر کا بیاہ ام کلثوم بنت علی سے ہوا۔عبداللہ کے بیٹے عبیداللہ،عون اور محمد کربلا میں شہید ہوئے،محمد بن جعفر اور عون بن جعفر کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویہ (ابن ہشام)،الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)،تاریخ الامم والملوک (طبری)، الجامع المسند الصحیح (بخاری)،المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم)،المحلّی (ابن حزم)،الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)،احکام القرآن (ابن عربی)،اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہ (ابن اثیر)،الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)،البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)،تاریخ الاسلام (ذہبی)،سیر اعلام النبلا (ذہبی)، فتح الباری (ابن حجر)،الاصابہ فی تمییز الصحابہ (ابن حجر)،حلیۃ الاولیاء (ابونعیم اصفہانی)،Wikipedia۔

محمد عمار خان ناصر

حزب اللہ کے دیس میں

۔۲۔

عارف حسین نے الشیخ طاہر سلیم کردی سے ہماری ملاقات کا اہتمام بھی کیا تھا جو لبنان کے نائب امین الفتویٰ ہیں۔ یہ ملاقات بیروت شہر کے عین وسط میں واقع بے حد خوب صورت جامع مسجد محمد خاتم النبیین کے ساتھ ان کے دفتر میں ہوئی۔ مسجد ایک چوک میں واقع ہے اور اس کے اردگرد کا سارا علاقہ بیروت کا بلکہ شیخ کے بیان کے مطابق پورے شرق اوسط کا مہنگا ترین علاقہ ہے اور یہاں جائیداد کی قیمت دوبئ سے بھی زیادہ ہے۔ شیخ کے دفتر کی کھڑکی باہر کی طرف جس سڑک پر کھلتی ہے، شیخ نے بتایا کہ ۷۵ء سے ۹۰ء تک کی خانہ جنگی کے زمانے میں یہ سڑک متحارب فریقوں کے مابین حد فاصل کی حیثیت رکھتی تھی اور سڑک کے مغرب میں واقع علاقہ مسلمانوں کے، جبکہ مشرق کی طرف کا علاقہ مسیحیوں کے زیر تصرف تھا۔ دونوں فریق مسلح تھے اور باقاعدہ منظم ہو کر ایک دوسرے کے علاقوں پر حملے کیا کرتے تھے۔ شیخ طاہر سلیم ماشاء اللہ نوجوان، وسیع المطالعہ اور صاحب علم وفضل شخصیت ہیں۔ علم حدیث سے خاص شغف رکھتے ہیں۔ انھوں نے مختلف مشائخ حدیث سے اپنی ملاقاتوں کے واقعات بھی سنائے۔ دوران گفتگو مولانا عاشق الٰہی بلند شہری رحمہ اللہ علیہ کا ذکر ہوا تو انھوں نے بڑی محبت اور عقیدت سے بتایا کہ وہ ان کے شاگرد ہیں اور مدینہ منورہ میں ان کی صحبتوں سے مستفید ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے الشیخ عبد الفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ علیہ کا ذکر بھی کیا اور بتایا کہ شیخ کے انتقال سے کچھ ہی عرصہ پہلے ان کی شیخ سے آخری اور تفصیلی ملاقات ہوئی جسے انھوں نے ویڈیو کیمرے کے ذریعے سے باقاعدہ محفوظ کر لیا۔

شیخ طاہر سلیم نے کہا کہ فرانسیسی حکمرانوں نے اپنے دور انتداب میں مسلمانوں کے ساتھ دو بڑی زیادتیاں کیں۔

ایک یہ کہ ان کے تعلیمی و مذہبی اداروں کے اوقاف ضبط کر لیے جو بعد میں مختلف مذہبی گروہوں اور سرکاری تحویل میں چلے گئے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ ساحل سمندر کے ساتھ واقع وہ سارا علاقہ جہاں اس وقت بیروت کا ایئر پورٹ قائم ہے اور بلاشبہ اربوں روپے کی ماہانہ آمدن کا ذریعہ ہے، یہ مسلمانوں کے اوقاف میں شامل تھا۔ شیخ نے دوسری زیادتی یہ بتائی کہ فرانس نے جانے سے پہلے یہاں تقسیم اقتدار کا ایسا فارمولا بنایا جس کی رو سے لبنان کی صدارت مستقل طور پر مارونی مسیحیوں کا حق قرار پائی۔ اس کے علاوہ بھی اہم سرکاری مناصب انھی کے پاس ہیں۔ شیخ نے بتایا کہ اب اہل تشیع اقتدار میں اشتراک کے اس فارمولے پر مطمئن نہیں ہیں اور اس تناسب کو بدلنے کے لیے وقتاً فوقتاً آواز بلند کی جا رہی ہے۔ شیخ نے یہ بھی فرمایا کہ لبنان میں مذہبی اور نسلی حوالے سے ایک خاص تناؤ پایا جاتا ہے اور مسلمانوں کو بہرحال بڑی احتیاط اور توازن سے کام لینا پڑتا ہے، تاہم اس ماحول میں دعوت اسلام کے بھی بڑے امکانات ہیں اور ہم پر اس ضمن میں بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ شیخ نے لبنان کے اہل سنت کے زیر اہتمام قائم بعض جامعات اور دعوتی اداروں کے متعلق بھی بتایا اور فرمایا کہ اگر ہم وقت نکال سکیں تو وہ ہمیں ان اداروں کا وزٹ کرانے کا اہتمام کر سکتے ہیں، لیکن ہمارے تربیتی کورس کا پہلے سے طے شدہ شیڈول اس میں بھی مانع رہا اور کوئی صورت نہ بن سکی۔ شیخ طاہر سلیم سے ملاقات جتنی مفید اور معلومات افزا تھی، افسوس ہے کہ اتنی ہی مختصر بھی رہی۔ وہ اپنی مصروفیات میں سے خاص طور پر وقت نکال کر ہماری ملاقات کے لیے مسجد محمد میں تشریف لائے تھے اور اس کے بعد بھی انھیں کہیں جانا تھا۔ چنانچہ ہم عشا کی نماز پڑھ کر ان سے رخصت ہوئے۔

بیروت کے بعض حصوں کو دیکھنے کی تقریب ایران سے آئے ہوئے شیعہ عالم الشیخ محمد ابراہیمی نے پیدا کی۔ ریڈ کراس کے زیر اہتمام بین الاقوامی انسانی قانون سے متعلق تربیتی کورس کے لیے ہمیں بیروت کے محلے حازمیہ کے ایک مشہور اور معیاری ہوٹل فندق روتانا میں ٹھہرایا گیا تھا۔ حازمیہ مسیحی آبادی کا علاقہ ہے۔ میں نے ۲۸/ مارچ کو ہوٹل میں پہنچتے ہی استقبالیہ سے معلوم کیا کہ یہاں قریبی مسجد کون سی ہے تو جواب ملا کہ مسجد یہاں سے خاصے فاصلے پر ہے اور شاید ٹیکسی لے کر وہاں جانا پڑے گا۔ خیر میں عصر کی نماز کے بعد باہر نکلا اور خاصی دور تک سڑکوں پر گھوم پھر کر مسجد تلاش کرتا رہا، لیکن واقعتاً قریب میں کوئی مسجد نہیں تھی، البتہ ایک آدھ گرجا ضرور دکھائی دیا۔ اگلے دن فجر کے وقت مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے ہوٹل کے عقب میں دور سے کہیں اذان کی مدھم سی آواز آ رہی ہے۔ خیر میں نے ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب کے کمرے میں ان کے ساتھ باجماعت نماز ادا کرنا شروع کر دی۔ ایک دو روز کے بعد قاری محمد حنیف جالندھری بھی پہنچ گئے اور پھر باقی ایام کے لیے وہی ہمارے مستقل امام قرار پائے۔ ہمارے قیام کے دوران

میں دو جمعے آئے اور اہل عرب کو خطبہ جمعہ سنانے اور نماز کی امامت کرانے کا اعزاز باری باری قاری محمد حنیف صاحب اور ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب کو ملا۔ قاری محمد حنیف صاحب نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم پر مشتمل وہ جامع خطبہ پڑھا جو برصغیر میں عام طور پر جمعہ کے موقع پر پڑھا جاتا ہے جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے اور متعدد حضرات نے ایسا فصیح و بلیغ اور جامع خطبہ پڑھنے پر انھیں داد دی۔ جمعے کی نماز سے فارغ ہوتے ہی بیشتر حضرات نے وہیں جمع بین الصلاتین کرتے ہوئے عصر کی نماز بھی ادا کرنا چاہی۔ قاری محمد حنیف صاحب نے حنفی فقہ کے مطابق معذرت کر لی تو امامت کے لیے ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب کو آگے کر دیا گیا۔ بعد میں ایک موقع پر حالت سفر میں نماز قصر کرنے کا ذکر ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے ایک عرب دوست کو بتایا کہ ہم حنفی ہیں اور احناف کے نزدیک پندرہ دن سے کم مدت سفر میں نماز قصر کی جاتی ہے۔ قاری حنیف صاحب تاک میں تھے۔ انھوں نے فوراً پھبتی کسی کہ ڈاکٹر صاحب مدت سفر کے معاملے میں تو حنفی ہیں، لیکن جمع بین الصلاتین کے معاملے میں نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ ان کی رائے میں جمع بین الصلاتین کے جواز پر احادیث میں مضبوط دلائل موجود ہیں، اس لیے وہ حنفی ہونے کے باوجود اس مسئلے میں دوسرے ائمہ کی رائے کو زیادہ درست سمجھتے ہیں۔ راقم کی رائے میں بھی یہی موقف اقرب الی الصواب ہے، چنانچہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حنفی ہونے کے باوجود دوسرے بہت سے مسائل کی طرح اس مسئلے میں بھی شوافع وغیرہ کے موقف کو ترجیح دی ہے۔ (ازالۃ الخفاء ۲/۹۵)

خیر ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہم جس علاقے میں ٹھہرے ہوئے ہیں، وہ مسیحی آبادی کا ہے، چنانچہ تین چار روز تک ہم آپس میں اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے رہے کہ یہاں کے مسلمان دین سے کس قدر لاتعلق ہیں کہ پورے محلے میں کہیں کوئی مسجد نہیں ہے۔ ادھر ایران سے آئے ہوئے الشیخ محمد ابراہیمی اپنے طور پر ہوٹل سے خاصے فاصلے پر اہل تشیع کی ایک دو مسجدیں تلاش کر چکے تھے۔ ایک دن باہمی گفتگو میں مسجد کا ذکر ہوا تو انھوں نے بتایا کہ انھیں مسجد کا راستہ معلوم ہے اور وہ روزانہ ایک آدھ نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے وہیں جاتے ہیں۔ چنانچہ اس دن ہم عصر کے بعد اکٹھے نکلے اور شیخ کی راہ نمائی میں ایک مسجد جا پہنچے۔ ہماری خوش گمانی تھی کہ شاید یہ اہل سنت کی کوئی مسجد ہوگی۔ مسجد کے قریب پہنچے تو کوئی نوجوان لاؤڈ اسپیکر پر نہایت خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا اور ذرا فاصلے سے ہی اس کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی، لیکن قریب جا کر دیکھا تو وہ اہل تشیع کی مسجد نکلی۔ اب شیخ ابراہیمی ساتھ تھے اور ہمارے لیے 'پاے رفتن نہ جاے ماندن' کی صورت حال تھی۔ بہر حال مغرب کی نماز میں ابھی کچھ وقت تھا۔ قاری محمد حنیف صاحب نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا کہ ابھی خاصا وقت ہے، اس لیے آگے کسی اور مسجد کی طرف

چلتے ہیں۔ شیخ ابراہیمی بھی سادہ پرکار تھے، ہمیں لے کر آگے چل دیے اور تھوڑی ہی دور واقع مسجد الحسنین میں لے گئے جو لبنان کے سب سے بڑے شیعہ عالم اور مرجع الشیخ حسین فضل اللہ کی مسجد ہے جنھیں ان کے علمی مقام و مرتبہ اور تصنیفی و تحقیقی خدمات کی وجہ سے پوری شیعی دنیا میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ پتہ چلا کہ شیخ حسین فضل اللہ خود تو ان دنوں خاصے علیل ہیں اور نماز کی امامت اور خطبۂ جمعہ وغیرہ کی ذمہ داری ان کے صاحبزادے کے سپرد ہے۔

مسجد الحسنین ایران اور عراق کے مخصوص شیعہ طرز تعمیر کے مطابق بنائی گئی بے حد خوب صورت، شان دار اور وسیع مسجد ہے اور حسن انتظام، صفائی ستھرائی اور خوش سلیقگی کا بہت عمدہ نمونہ پیش کرتی ہے۔ ہم نے یہاں زندگی میں پہلی مرتبہ کسی شیعہ عبادت گاہ میں شیعہ امام کے پیچھے نماز مغرب ادا کی۔ میں صف میں کھڑا ہوا تو محسوس ہوا کہ میرے اور دائیں اور بائیں کھڑے نمازیوں کے مابین خاصا فاصلہ ہے، چنانچہ میں نے ایک طرف کے نمازی کے قریب ہو کر دوسری طرف کھڑے صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ ساتھ ہو جائیں، لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس پر دوسری طرف کے صاحب نے مجھے کہا کہ آپ واپس اپنی جگہ پر چلے جائیں۔ میں نے ذرا توجہ سے دائیں بائیں دیکھا تو پوری صف کی صورت حال یہ تھی کہ ہر نمازی مصلے پر بنی ہوئی محراب کی جگہ پر کھڑا تھا اور ہر دو نمازیوں کے مابین اتنی جگہ خالی چھوڑ دی گئی تھی کہ مجھ جیسا دبلا پتلا نمازی وہاں آسانی سے کھڑا ہو سکتا تھا۔ خیر نماز شروع ہوئی۔ طریقہ نماز یہ تھا کہ تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک رکوع و سجود اور قومہ و جلسہ کی تسبیحات اور دعاؤں سمیت ساری نماز جہری تھی۔ امام صاحب نے اللہ اکبر کہتے ہی فوراً سورۂ فاتحہ کی تلاوت شروع کر دی۔ نماز کے ہر رکن میں ''اللّٰھم صل علی محمد و آل محمد '' کا ورد کیا گیا، جبکہ دوسری یا تیسری رکعت میں دعاے قنوت بھی پڑھی گئی۔ آخر میں ایک سلام سے نماز ختم کی گئی اور شیعہ حضرات کے مخصوص طریقے کے مطابق بار بار ہاتھ اٹھا کر رفع یدین کیا گیا۔ سلام پھرنے کے بعد ہر آدمی نے دائیں بائیں نمازیوں سے مصافحہ کیا۔ ایک اور دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جیسے ہی امام صاحب تیسری رکعت میں سجدے سے اٹھ کر تشہد کے لیے بیٹھے، میری بائیں جانب کھڑے صاحب، جو ابتدا سے نماز میں شریک تھے، امام صاحب کے سلام پھیرنے سے پہلے ہی اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک رکعت مزید شامل کر کے چار رکعتیں مکمل کر لیں۔ پھر یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں یہاں نو وارد اور شیعہ طریقہ نماز سے ناواقف ہوں، انھوں نے میرے سامنے باقاعدہ وضاحت کی کہ میں مغرب کی نماز پہلے پڑھ چکا ہوں اور یہ میں نے عشاء کی نماز ادا کی ہے۔

بہر حال یہ تجربہ دلچسپ رہا۔ میرے ذہن میں اس سے پہلے شیعہ اور سنی طریقۂ نماز کا نمایاں فرق یہی تھا کہ اہل سنت عام طور پر ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور شیعہ ہاتھ کھلے چھوڑ کر اور یہ کہ وہ سجدے کے لیے ٹھیکری یا لکڑی

کا کوئی ٹکڑا سامنے رکھ لیتے ہیں۔ (مسجد الحسنین میں، میں نے بعض لوگوں کو ٹشو پیپر پر سجدہ کرتے ہوئے بھی دیکھا۔) لیکن یہاں تو معاملہ وہ نکلا کہ:

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہو گا کوئی زخم

تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

شیعہ امام کے پیچھے نماز کا ارتکاب کرنے کے بعد ہم تینوں سنی اکٹھے ہوئے تو باہم مشورہ ہوا کہ نماز ہو گئی ہے یا نہیں؟ قاری محمد حنیف صاحب نے بتایا کہ انھوں نے نماز دہرا لی ہے، جبکہ ڈاکٹر عصمت اللہ نے کہا کہ وہ اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے کہ میرے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں یا تو نماز دہرا لیتا یا نہ دہراتا، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بعد میں الشیخ طاہر سلیم کردی سے ملاقات میں ہم نے ان سے مسجد الحسنین میں نماز مغرب کی ادائیگی کا ذکر کیا اور پوچھا کہ شیعہ کے پیچھے نماز ادا ہو جاتی ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا کہ یہاں لبنان میں معمول یہی ہے کہ اہل سنت، شیعہ کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے۔ ہم نے پوچھا کہ معمول سے ہٹ کر اصولی طور پر اس کی گنجایش ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں شیخ نے مالابار کے ایک معروف شافعی فقیہ کی کتاب ''فتح المعین'' کی یہ عبارت سنائی کہ:

'وتجوز الصلاة خلف الرافضی اذا لم یصرح بما یکفر به و کانت ارکانها توافق ارکاننا'

یعنی اگر رافضی اپنے کفریہ عقائد کا برملا اظہار نہ کرتا ہو اور اس کی نماز کے بنیادی ارکان ہماری نماز کے ارکان کے مطابق ہوں تو اس کے پیچھے نماز ادا ہو جائے گی۔ مجھے یاد آیا کہ امام ابن تیمیہ نے بھی، جو اسلامی تاریخ میں شیعہ سنی علمی نزاعات کے حوالے سے اہل سنت کے شاید سب سے ممتاز وکیل ہیں، اپنے فتاویٰ میں روافض کے گمراہ کن اور کافرانہ عقائد پر سخت ترین تبصرے کرنے کے باوجود رافضی امام کی اقتدا میں نماز کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ اس بات کو اہل سنت کے مقابلے میں گمراہ فرقوں کی خصوصیت شمار کیا ہے کہ وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے فرقے کے امام کے پیچھے نماز ادا کرنے کو جائز نہیں سمجھتے۔

شیخ محمد ابراہیمی جامعہ شہید بہشتی قم میں استاذ اور متعدد علمی کتابوں کے مصنف ہیں۔ نہایت سادہ، نرم خو اور مرنجاں مرنج شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کا جھکاؤ اہل تشیع کے طبقہ اصولیین کی طرف تھا، چنانچہ وہ بار بار قرآن اور اس کے بعد عقل کی اہمیت پر زور دیتے اور ان کے مقابلے میں اخبار و روایات کو زیادہ اہمیت نہ دینے پر اصرار کرتے تھے، بلکہ ان کا کہنا تھا کہ اگرچہ شیعہ اصول فقہ میں عقل کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے اور ایک مجتہد اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے براہ راست نصوص سے استنباط کا اصولی طور پر اختیار رکھتا ہے، لیکن اہل تشیع کے مراجع بھی اب

اس اصول سے عملاً کام نہیں لیتے اور تقلیدی منہج پر ہی فتوے جاری کرتے رہتے ہیں۔ شیخ ابراہیمی سے مختلف مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا رہا۔ خلافت و امامت کے موضوع پر بات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک اجتہادی اور سیاسی نوعیت کا اختلاف تھا۔ صحابہ کی اکثریت نے یہ سمجھا کہ حضرت ابوبکر اس منصب کے زیادہ حق دار ہیں اور انھوں نے انھیں خلیفہ منتخب کر لیا۔ جہاں تک روحانی فضیلت کا تعلق ہے تو تصوف کے زیادہ تر سلسلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ اپنی نسبت سیدنا علی کے واسطے سے جوڑتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملے میں حضرت علی کی افضلیت کو اہل سنت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ مستند شیعہ اکابر کی تصریحات اس کے برعکس ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سیدنا علی کی بیعت نہیں کی، انھوں نے ارتداد کا ارتکاب کیا۔ شیخ نے اس کا دلچسپ جواب دیا اور کہا کہ ایسی عبارات میں 'ارتدوا' کا لفظ تردد اور اشتباہ کے معنی میں ہے، یعنی صحابہ کو اشتباہ لاحق ہو گیا اور وہ تردد میں پڑ گئے کہ اس معاملے میں کیا فیصلہ کریں۔ تحریف قرآن کے حوالے سے شیخ نے کہا کہ اہل تشیع اس کے قائل نہیں اور موجودہ قرآن کو ہی اصل اور مکمل قرآن مانتے ہیں، بلکہ انھوں نے ایک دلچسپ بات یہ کہی کہ عام طور پر علامہ نوری طبرسی کی کتاب ''فصل الخطاب'' کو اس بات کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ شیعہ تحریف قرآن کے قائل ہیں، حالانکہ مصنف نے یہ کتاب اس کے برعکس یہ ثابت کرنے کے لیے لکھی ہے کہ قرآن میں تحریف نہیں ہوئی۔

ایک دن کھانے کی میز پر ان سے جمع بین الصلاتین کے مسئلے پر بات ہوئی۔ میں نے شیخ ابراہیمی سے پوچھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تو نماز کے پانچ اوقات مقرر کیے ہیں اور عام معمول میں ہر نماز اپنے اپنے وقت میں ہی ادا کی ہے تو پھر شیعہ حضرات ظہرین اور مغربین کو جمع کیوں کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایک حدیث میں حالت حضر میں کسی عذر کے بغیر بھی آپ کے جمع بین الصلاتین کرنے کا ذکر ہوا ہے۔ ان کا اشارہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی اس مشہور حدیث کی طرف تھا جس میں 'من غیر خوف و لا مطر' نمازیں جمع کیے جانے کا ذکر ہوا ہے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ نے کہا کہ: 'ولکن هذا الحديث لم ياخذ به احد من الفقهاء' (اس حدیث کو فقہا میں سے کسی نے بھی اختیار نہیں کیا)۔ اس پر شیخ نے برجستہ جواب دیا: 'نحن اخذنا به' (ہم نے اختیار کیا ہے)۔ البتہ اس بات کا کوئی تشفی بخش جواب ان سے نہ مل سکا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر عذر کے ہی سہی، حضر میں جمع بین الصلاتین کرنے کا واقعہ ایک آدھ مرتبہ کا ہے تو پھر اہل تشیع کے ہاں اسے ایک مستقل معمول کی حیثیت سے کیوں اختیار کر لیا گیا ہے۔ بہرحال شیخ ابراہیمی کے حسن طبیعت کی وجہ سے ان سے بے تکلفی کا تعلق بن گیا اور عمر کے

باہمی تفاوت کے باوصف ہم ان کے ساتھ مزاح بھی کرتے رہتے تھے جس کا انھوں نے بالکل برا نہیں منایا۔

بیروت میں دو ہفتے کے قیام کے دوران میں پہلی مرتبہ فصیح کتابی عربی سے ہٹ کر اس عامیانہ زبان سے واسطہ پڑا جس کے قصے اور لطائف اس سے پہلے بالواسطہ سننے میں آتے تھے۔ تربیتی کورس کے بیشتر محاضرات عربی زبان میں، جبکہ چند ایک انگریزی زبان میں تھے جس کے لیے فوری عربی ترجمے کا انتظام کیا گیا تھا۔ زیادہ تر ماہرین نے فصیح عربی میں گفتگو کی اور ان کا مدعا سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، تاہم مصر اور لبنان کے بعض حضرات کی زبان پر عامی لہجہ اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ ایک علمی موضوع پر بات کرتے ہوئے بھی انھیں فصیح لہجے میں گفتگو کرنے میں دقت پیش آتی تھی۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب نے تو سترہ اٹھارہ سال سعودی عرب میں گزارے ہیں، اس لیے انھیں عامی لہجے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، تاہم ہمارے لیے ان حضرات کی گفتگو میں اکثر ''زبان یار من عامی و من عامی نہ می دانم'' کی صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ ڈاکٹر عصمت اللہ نے مختلف مواقع پر دو تین مرتبہ فاضل محاضر کو روک کر درخواست کی کہ بعض حضرات عامی لہجہ نہیں سمجھ سکتے، اس لیے ازراہ کرم فصحی میں گفتگو کی جائے۔ فاضل محاضر نے کہا کہ اچھا، میں کوشش کرتا ہوں، لیکن چند منٹ کے بعد بے ساختہ ان کی پٹری بدل جاتی اور وہ عامی لہجہ بولنا شروع کر دیتے۔ اس پر مجھے زمانۂ طالب علمی کا ایک لطیفہ یاد آ جاتا۔ ۱۹۸۹ء میں، میں مدرسہ انوار العلوم گوجرانوالہ میں درجۂ رابعہ کا طالب علم تھا۔ شرح جامی کے نصف اول کی تدریس مولانا قاضی حمید اللہ خان کرتے تھے، جبکہ نصف ثانی مولانا سید عبد المالک شاہ صاحب کے سپرد تھا۔ کلاس میں اکثریت پٹھان طلبہ کی تھی، جبکہ ایک آدھ پنجابی طالب علم بھی تھا۔ سید عبد المالک شاہ صاحب ہماری رعایت سے اردو میں سبق پڑھانا شروع کرتے، لیکن تھوڑی دیر کے بعد انھیں محسوس بھی نہ ہوتا اور وہ پشتو بولنا شروع کر دیتے۔ کچھ وقت گزرنے پر انھیں تنبہ ہوتا تو وہ فرماتے، ''اوہو، میں پشتو بول رہا ہوں''۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اردو میں تقریر شروع کرتے، لیکن یہ سلسلہ جاری رہتا۔

میں نے یمن کے الدکتور احمد سے کہا کہ مجھے مصری اور سوری لہجے سمجھنے میں کافی دقت پیش آتی ہے اور بعض اوقات لگتا ہے کہ ہم کوئی بالکل نئی زبان سیکھ رہے ہیں (انه بمثابة تعلم لغة جديدة تماما)۔ اس پر وہ بہت ہنسے اور کہا کہ بعض اوقات خود ہمیں بھی یہ لہجے سمجھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ بہر حال دو ہفتے کی مدت میں اس عامی عربی کے جو موٹے موٹے صرفی ونحوی قاعدے یا بے قاعدگیاں میری سمجھ میں آ سکیں، وہ یہ ہیں:

مضارع کے صیغوں پر باے جارہ داخل کرنا عام معمول ہے، مثلاً: 'تتكلم' کو 'بتتكلم' اور 'تشتری' کو 'بتشتری' پڑھتے ہیں۔

حرف جر کے معمول اور مضاف الیہ پر جر کے بجاے رفع یا نصب پڑھا جاتا ہے، مثلاً: 'فی حد ذاته، نهنئه علی زیادة وزنه'۔

'کلها' یا اس طرح کی تاکیدات میں متبوع کے اعراب کی موافقت کے بجاے ہر جگہ نصب پڑھتے ہیں۔ (الشیخ طاہر سلیم کردی نے گفتگو کرتے ہوئے اسی عادت کے مطابق دو تین دفعہ 'کلها' کہا، لیکن پھر فوراً متنبہ ہو کر اعراب درست کیا اور مجلس میں موجود ایک نوجوان فاضل الاستاذ خلیل عجینہ کی طرف اشارہ کر کے، جو عربی ادب میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، کہا کہ: 'هو یحاسبنا علی ذالك' یعنی وہ اس طرح کی غلطیوں پر ہمارا محاسبہ کرتے ہیں)۔

'نحن' کو 'احنا' بولا جاتا ہے اور 'کیف انت' کو 'کیفك'۔ اسی طرح 'انه' اور 'انه' کو مخفف کر کے 'انو' اور 'انو' پڑھا جاتا ہے اور 'الذی' اور 'التی' نے 'الی' کی شکل اختیار کر لی ہے۔

مصری لہجے میں جیم مستقلاً گاف پڑھی جاتی ہے، جبکہ 'ثاء' کا تلفظ عامی زبان میں مستقلاً 'تا' کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ قاف کو کبھی گاف سے اور کبھی ہمزہ سے بدل دیا جاتا ہے۔ مثلاً 'یقول' کو 'یگول' یا 'یئول' پڑھا جائے گا۔ دلچسپ صورت حال 'دقائق' جیسے الفاظ میں پیدا ہوتی ہے جب وہ اس کو 'دء ائی' پڑھتے ہیں۔

لام تعریف کے ہمزہ وصل کو ملا کر پڑھنے کا کوئی تصور نہیں اور ہر کلمے کو الگ الگ ادا کیا جاتا ہے۔ مثلاً 'الاعتراف الاقلیمی بشرعیة المقاومة الاسلامیة' کو یوں پڑھا جائے گا: 'الاعتراف الاقلیمی بشرعیة المقاومة الاسلامیة'۔ اس میں غالباً اس پہلو سے سہولت ہے کہ ہر کلمے کا اعراب ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

تائے مدورہ والے ہر کلمے میں 'تا' سے پہلے والے حرف پر کسرہ پڑھا جاتا ہے، مثلاً 'اللجنة الدولیة' کو 'اللجنة الدولیة' پڑھا جائے گا۔

'لیه؟' یہ ''کیوں'' کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ دراصل لام تعلیل، اس کے بعد یاے اشباع اور آخر میں ہاے سکتہ سے مرکب ہے۔

'بس' کا لفظ بالکل اردو مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً: 'بس عشرة دقائق' (بس دس منٹ)۔

الدکتور احمد ابوالوفا اپنی گفتگو میں بار بار 'خد لك' کا لفظ بول رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر عصمت اللہ سے اس کا مطلب پوچھا تو انھوں نے کہا کہ غالباً یہ 'خد لك' (ذرا دھیان کرو) کا مخفف ہے۔

عربوں کے پھیکے اور ابلے ہوئے کھانے چکھنے کا بھی زندگی میں پہلی مرتبہ موقع ملا۔ غالباً مولانا مودودی نے کسی مغربی ملک کے سفر سے واپسی پر یہ تبصرہ کیا تھا کہ وہاں کی ہر چیز پھیکی ہے، یہاں تک کہ عورتیں بھی۔ بیروت میں یہ

شکایت صرف کھانے کے بارے میں کی جاسکتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے کسی معروف ماخذ میں یہ واقعہ پڑھنا یاد ہے کہ جب مسلمانوں نے بلاد شام کو فتح کیا تو ان کے امیر لشکر کی طرف سے سیدنا عمر کے نام یہ درخواست بھیجی گئی کہ مجاہدین کو یہاں کی خواتین کے حسن نے متاثر کیا ہے اور وہ آپ سے ان کے ساتھ شادی کی اجازت کے متمنی ہیں۔ کیا بھلا زمانہ تھا! البتہ یہاں حسن زن کے تجارتی استعمال کا رنگ وہی ہے جو ایک جدید مغرب زدہ معاشرے میں ہوسکتا ہے اور یہاں کی سڑکوں اور تجارتی پلازوں میں گھومتے ہوئے جگہ جگہ ایسی بے ہودہ اور واہیات تصویروں پر مشتمل سائن بورڈ نظر آتے ہیں جو نگاہوں کو شرم سے بے اختیار جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ آداب طعام سے متعلق ایک خاص بد مذاقی جس کا مشاہدہ اپنے ملک میں ہوتا رہتا ہے، یہاں بھی دکھائی دی۔ بے حد تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کو بھی دیکھا کہ کھانے کی پلیٹ خوب اچھی طرح بھر کر لے آئے اور پھر تقریباً آدھا کھانا پلیٹ میں ضائع ہونے کے لیے چھوڑ کر کوئی اور چیز لینے کے لیے چلے گئے۔ ڈاکٹر عصمت اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ عربوں کا عام مزاج ہے اور عرب دنیا کے کھاتے پیتے لوگوں میں یہ منظر ہر جگہ دکھائی دیتا ہے۔

بیروت میں مجھے خاص طور پر یہ بات جاننے کا تجسس بھی رہا کہ یہاں کے اہل تشیع کا رویہ اہل سنت کے مذہبی احساسات و جذبات اور ان کی محترم مذہبی شخصیات کے بارے میں کیسا ہے۔ مسجد الحسنین کے باہر اہل تشیع کے ایک مکتبے پر میں کچھ دیر کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ ایک کتاب کسی شیعہ عالم نے اہل سنت اور اہل تشیع کے مابین نزاعی مسائل کے بارے میں مناظرانہ اسلوب میں لکھی تھی۔ مناظرے کا مزاج اور نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے۔ سیدنا عمر پر کیے جانے والے اعتراضات میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ صلح حدیبیہ تک ان کا ایمان پختہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ اس موقع پر وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے کی وجہ سے اسلام کی حقانیت کے حوالے سے سنگین شکوک وشبہات کا شکار ہو گئے تھے۔ اب اگر اس واقعے کو اس کے حقیقی تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر سیدنا عمر کے تحفظات اور شبہات دراصل ان کے ایمان و اسلام کی غیر پختگی نہیں بلکہ اس کے ساتھ شدید جذباتی تعلق کا نتیجہ تھے اور وہ مشرکین مکہ کے ساتھ کسی بھی درجے کی مصالحت کو دینی غیرت کے منافی سمجھتے تھے، چنانچہ صحیح بخاری کی روایت کے مطابق انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ: 'لم نعطی الدنیة فی دیننا؟' یعنی ہم اپنے دین کے معاملے میں ایک کمزور پوزیشن کیوں قبول کر رہے ہیں۔ یہ مناظرانہ نفسیات کا کمال ہے کہ ان کے اس ردعمل کو وہ مفہوم پہنا لیا جائے جو مذکورہ شیعہ مصنف نے پہنایا ہے۔ بہرحال اس نوع کی مناظرانہ بحثوں سے قطع نظر، میں نے اس ضمن میں شام اور لبنان سے تعلق رکھنے والے جن مختلف حضرات سے صورت حال دریافت

کی، ان سب کا جواب یہی تھا کہ یہاں اہل سنت کو شیعہ حضرات سے خلفاے ثلاثہ یا امہات المومنین کے بارے میں سب وشتم کے طرز عمل کی شکایت نہیں ہے۔ شیخ طاہر سلیم سے اس مسئلے پر بات ہوئی تو انھوں نے بھی اس کی تصدیق کی۔ ''ماذا تعرف عن حزب اللّٰہ'' کے عنوان سے علی الصادق کی لکھی ہوئی ایک کتاب میں بھی جو انٹرنیٹ پر عام دست یاب ہے اور جس میں حزب اللہ کے شیعی تشخص کا پہلو دلائل وشواہد کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے، یہ کہا گیا ہے کہ:

لا یظھرون ان امر یخدش مشاعر طوائف اھل السنة (تقیة) بل لا یتکلمون الا عن وحدة المسلمین وقتال الیھود المحتلین حتی زعیمھم حسن نصر اللّٰہ کان یتجنب الخوض فی المسائل الخلافیة بین السنة و الشیعة الامامیة. (۱۳۳)	''وہ کسی ایسے امر کا اظہار نہیں کرتے جس سے اہل سنت کے جذبات کو ٹھیس پہنچے (اور ایسا وہ تقیہ کے طور پر کرتے ہیں)، بلکہ وہ صرف مسلمانوں کی وحدت اور قابض یہودیوں کے خلاف جنگ کی بات کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کا لیڈر حسن نصر اللہ بھی اہل سنت اور شیعہ امامیہ کے مابین نزاعی مسائل میں الجھنے سے گریز کرتا ہے۔''

بیروت سے میں نے جو مختلف کتابیں اور رسائل خریدے، ان میں ایک رسالہ مصر کے فاضل محقق الاستاذ محمد سلیم العوا کا ہے جو 'العلاقة بین السنة و الشیعة' کے نام سے قاہرہ کے اشاعتی ادارے سفیر الدولیہ للنشر نے شائع کیا ہے۔ مصنف نے اس کے صفحہ ۴۶، ۴۷ پر ڈاکٹر علی جمعہ کے حوالے سے، جو پہلے مصر کے مفتی عام تھے اور اب شیخ طنطاوی کی وفات کے بعد جامعہ الازہر کے سربراہ ہیں، بتایا ہے کہ کچھ عرصہ قبل بیروت کے ایک شیعہ ناشر نے معروف شیعہ عالم علامہ مجلسی کی ضخیم کتاب ''بحار الانوار'' شائع کی تو اس میں سے پوری پانچ جلدیں (۲۹ تا ۳۳) حذف کر دیں اور ڈاکٹر علی جمعہ کے دریافت کرنے پر بتایا کہ ان جلدوں میں ایسا مواد موجود ہے جو صحابہ کرام پر سب اور قدح کے زمرے میں آتا ہے اور اس کی اشاعت فتنے کا باعث بن سکتی ہے جس میں ناشر شریک نہیں ہونا چاہتا، البتہ اس نے دیانت داری کے تقاضے سے ۲۸ ویں جلد کے بعد ۳۴ ویں جلد میں روایات کے نمبر مسلسل درج نہیں کیے تاکہ قاری پر واضح رہے کہ درمیان سے کچھ جلدیں چھوڑ دی گئی ہیں۔ میرے نزدیک اس طرح کے مسائل میں یہی رویہ بہتر اور قابل تقلید ہے اور مجھے اپنے یہاں کے ان سنی حضرات کی ''سمجھ داری'' کبھی سمجھ میں نہیں آئی جو اسٹیج سجانے کے لیے شیعہ مصنفین کی کتب اور ان کے واعظین کی تقاریر سے توہین آمیز مواد بڑی محنت سے خود نکال کر اسے عوام کے سامنے پیش کرتے اور ان کے ایمان واعتقاد میں ''اضافے'' کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

عقیل احمد انجم

کیا واقعی قیامت آنے والی ہے؟

کہا جا رہا ہے کہ سال ۲۰۱۲ء کے آخری مہینہ میں دنیا تباہ ہو جائے گی۔ یہ عقیدہ ایک قدیم تہذیب مایا کے ماننے والوں کا ہے۔ دنیا میں آباد ہر مذہب اور قوم کی اپنی ایک الگ تہذیب و ثقافت ہے، جبکہ کئی قدیم تہذیبیں بھی اس دنیا کی بنیاد ہیں۔ ایسی ہی ایک تہذیب جو مایا کہلاتی ہے، لاطینی امریکا کے بیشتر ممالک کی سب سے قدیم تہذیبوں میں شمار ہوتی ہے۔ یہ تہذیب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدایش سے بہت پہلے اس دنیا میں زندہ تھی۔ زیادہ مضبوط شواہد چھ سو قبل مسیح کو مایا تہذیب کے عروج کا نقطۂ آغاز بتاتے ہیں، جبکہ اس تہذیب کا دوسرا دور تیسری سے دسویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔ جنوبی میکسیکو، گوئٹے مالا، ایل سلواڈور سے لے کر بے لائیز اور مغربی ہونڈراس تک کم وبیش ہزاروں کلومیٹر وسیع و عریض خطے پر اس عظیم الشان تہذیب نے جنم لیا۔ میکسیکو ایک ایسی پراسرار جگہ ہے جہاں کئی ایسے راز ہیں جو ابھی تک دنیا پر کھل رہے ہیں، جبکہ اس کے کچھ باشندے اب بھی قدیم مایا زبانیں بول سکتے ہیں۔

مایا تہذیب زبان، حساب اور ستاروں کے علم میں بہت ترقی یافتہ تھی۔ ان کی تہذیبی اور ثقافتی برتری نے اردگرد کی دیگر اقوام کو بھی متاثر کیا۔ اس تہذیب کے باشندوں نے امریکا میں لکھائی کی ابتدا کی، جبکہ ان کے لکھنے کا طریقہ قدیم مصری زبان سے ملتا جلتا ہے۔ یہ لوگ الفاظ اور تصاویر کو ملا کر لکھی جانے والی زبان کے لیے جانوروں کے بالوں یا پروں سے بنا ہوا برش استعمال کرتے تھے۔ وہ درختوں کی چھالوں پر لکھتے تھے، جس کی چند کتابیں آج بھی محفوظ ہیں۔ مایا تہذیب کے کیلنڈروں میں اٹھارہ مہینے اور ہر مہینے میں بیس دن ہوتے تھے، یعنی سال میں تین سو ساٹھ دن۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے بنائے ہوئے کیلنڈر ہمارے آج کے عیسوی کیلنڈرز سے بہت زیادہ درست ہیں۔ ان کا حساب اتنا درست ہے کہ فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ سورج کب نصف النہار پر ہوگا، سال کے کن حصوں میں دن

رات برابر ہوں گے، ہمارے نظام شمسی میں دیگر سیارگان کے گزرنے کے راستے اور اوقات کیا ہوں گے، زہرہ اور مریخ کے مدار کون کون سے ہیں وغیرہ۔

اس تہذیب کا اپنا حساب کتاب کرنے کا نظام بھی تھا۔ اس نظام میں فقط تین نشانات استعمال ہوتے تھے جس میں لکیر، نقطہ اور سیپ کا نشان شامل ہے۔ اس میں لکیر کے معنی پانچ، سیپ کے معنی صفر اور نقطہ کے معنی ایک ہیں۔ ان تین نشانوں کے ذریعے بغیر پڑھے لکھے لوگ بھی بڑے سے بڑا حساب کتاب کر لیتے تھے۔ مایا تہذیب بظاہر صدیوں پہلے ہی زوال پذیر ہو چکی ہے، مگر مایا قوم کی اولادیں آج بھی میسوامریکن علاقوں میں موجود ہیں۔ ان میں بہت سارے لوگ اب بھی مایا مذہب کی بہت سی رسومات پر عمل کرتے ہیں، مگر ان کے پیچیدہ رسم الخط کو وہ بھول چکے ہیں۔ اس تہذیب کی سب سے قابل ذکر ایجاد ان کا کیلنڈر مانا جاتا ہے۔ مایا کیلنڈر کے مطابق ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ء کو پانچ ہزار ایک سو چھبیس برس پر مشتمل ایک دور کا خاتمہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس دن ایک بڑی قدرتی آفت کے ذریعے قیامت برپا ہو جائے گی، جبکہ مایا برادری پر تحقیق کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ دنیا پانچ عہدوں میں بٹی ہوئی ہے اور مایا لوگ چوتھے عہد میں جی رہے ہیں۔ ان کے کیلنڈر کے مطابق چوتھے عہد کو ہمارے آج کے عیسوی کیلنڈر کے حساب سے اکیس دسمبر میں ختم ہو جانا ہے اور پھر اس کے بعد دنیا کا آخری اور پانچواں عہد شروع ہو جائے گا۔

یہ تو ایک قدیم قوم ہے جس کا یہ عقیدہ ہے، لیکن مغرب میں پڑھا لکھا ایک طبقہ ہے جو اس خوف میں مبتلا ہے کہ ۲۰۱۲ء میں کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ لوگوں کو اس سال قیامت واقع ہوتی نظر آ رہی ہے۔ بعض لوگوں کو دجال کی چاپ قریب سنائی دے رہی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سال بدی کی قوتوں کا امام ''امریکا'' قدرتی آفات و بلیات کی خوف ناک لپیٹ میں آ کر سمندر برد ہو جائے گا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ رواں سال ''اسرائیل'' صفحۂ ہستی سے مٹ جانے والا ہے۔ مغربی معاشرے اس حوالہ سے کچھ زیادہ ہی خوف میں مبتلا ہیں، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس خوف کا اصل بخار مغربی معاشرہ کو ہی چڑھا ہوا ہے۔ ان کے بعض حلقوں میں یہ بات عقیدہ کی حد تک راسخ ہو چکی ہے کہ ۲۰۱۲ء کے دوران میں یہ دنیا مختلف موسمیاتی یا ماورائی تبدیلیوں کا شکار ہو کر ٹوٹ پھوٹ جائے گی اور یوں اس زمین پہ زندگی اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی۔ مغرب کے کئی مفکر اور اسکالرز اس نقطۂ نظر کے پرزور حامی ہیں۔ اس حوالہ سے جس تاریخ کا خصوصی طور پر ذکر کیا جاتا ہے، وہ ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ء ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت ساٹھ ہزار ویب سائٹس ایسی ہیں جہاں اس تاریخ کے بارہ میں پیشین گوئیوں پر مبنی مواد موجود ہے۔ ان میں سے بعض ویب سائٹس پر باقاعدہ ڈاؤن کاؤنٹر لگے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ ہر لمحہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا کس طرح لمحہ بہ

لمحہ اپنے خاتمہ کی طرف محو سفر ہے اور اس کے خاتمہ میں مزید کتنے لمحات باقی ہیں۔اس کے علاوہ اس موضوع پر مغرب میں بے شمار کتابیں بھی لکھی جا چکی ہیں۔مشرق میں یہ خوف مغرب سے ہی برآمد ہو کر آیا ہے۔

دلائل اور حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس موضوع پر قلم اٹھانے والے لکھاریوں کے دعویٰ کے مطابق اہل دنیا کا یہ خوف بلاوجہ نہیں۔ان کے مطابق اس بات کے کئی ماورائی اور سائنسی ثبوت موجود ہیں کہ ۲۰۱۲ء میں دنیا کے اندر کچھ غیر معمولی تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہونے والی ہیں۔ذیل میں ہم ان شواہد کا ایک جائزہ لیتے ہیں اور ان پہ رائے زنی کی کوشش بھی کرتے ہیں کہ آیا واقعی ان کی بنیاد پر ۲۰۱۲ء سے ڈرنا اور خوف کھانا درست ہے؟

ماورائی شواہد کے ضمن میں مختلف مذاہب کی مذہبی روایات ذکر کی جاتی ہیں،لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان مذہبی روایات میں سے بعض کے اندر تو سرے سے کوئی ایسا اشارہ ہی نہیں ملتا،جس سے معلوم ہو کہ بنی نوع انسان کو ۲۰۱۲ء سے ڈرنے کی ضرورت ہے، بلکہ اس کے برعکس ان پیشین گوئیوں میں (مجمل الفاظ میں) یہ خوش خبری اور نوید نظر آتی ہے کہ ۲۰۱۲ء میں حق اور سچائی کا آفتاب طلوع ہونے والا ہے۔مثلاً ہندومت کی روایات کے مطابق ۲۰۱۲ء سے حق اور صداقت کے دور کا آغاز ہونے والا ہے۔بدھ مت کے بعض راہبوں کے مطابق ''بدھا'' کی پیشین گوئی کی رو سے ۲۰۱۲ء میں ایک سنہری دور (golden age) شروع ہونے والا ہے۔تاہم یہودی اور عیسائی روایات کے مطابق اگرچہ ۲۰۱۲ء کے دوران یا اس سے پہلے دنیا کے اندر قتل و غارت،خوں ریزی اور فتنہ و فساد کے کچھ واقعات رونما ہوں گے،مگر ان میں بھی انجام کار حق کے پیروکار صاف بچ جائیں گے اور منکرین حق پر عذاب الٰہی نازل ہو گا۔ یوں اپنی اپنی روایات کی روشنی میں عیسائیوں اور یہودیوں کو بھی ۲۰۱۲ء سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ وہ اپنے ہی عقیدہ کے مطابق خدا کے محبوب اور لاڈلے ہیں اور ان کی اپنی روایات کے مطابق خدا اس سال اپنے فرماں برداروں کو ''فتحِ مبین'' عطا فرمائے گا۔نہ جانے پھر مغرب اور خصوصاً امریکا میں ایسی باتیں کیوں روز بروز مقبول ہوتی جا رہی ہیں جو ۲۱ دسمبر ۲۰۱۲ء کی تباہی سے بچنے کے لیے زیر زمین پناہ گاہیں تیار کر کے فروخت کرتی ہیں اور نہ جانے انھیں خریدار کہاں سے میسر آ جاتے ہیں! رہ گئے مسلمان تو دوسرے مذاہب کی روایات پر ان کا سرے سے ایمان ہی نہیں اور ان کا اپنا مذہب اس حوالہ سے بالکل خاموش ہے۔لہٰذا ان کا ۲۰۱۲ء سے ڈرنا اور گھبرانا تو بالکل ہی کوئی معنی نہیں رکھتا۔

سائنسی انکشافات اور شواہد کے ضمن میں جن امور کا ذکر کیا جاتا ہے،ان میں بھی کوئی ایسا نہیں جسے اطمینان بخش، حتمی اور قطعی کہا جا سکے۔سائنسی شواہد کے ضمن میں جو ''معتبر نام'' لیا جاتا ہے، وہ امریکی خلائی ادارے ''ناسا'' کا

ہے۔اس سلسلہ میں''ناسا'' کی طرف بہت کچھ منسوب کیا جاتا ہے،مگر میں نے خود''ناسا'' کی ویب سائٹ پر اس حوالہ سے جو کچھ دیکھا،اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ:

''۲۰۱۲ء میں دنیا کے اندر کوئی برا واقعہ پیش نہیں آئے گا۔ ہمارا سیارہ چار ارب سال سے زیادہ عرصہ کے لیے بالکل فٹ فاٹ ہے۔معتبر سائنس دان ۲۰۱۲ء میں پوری دنیا کو لاحق کسی بھی خطرہ کے بارہ میں کچھ نہیں جانتے۔''

ایک مسلمان کا ایمان ہے کہ یہ دنیا تباہ ہونے کے لیے بنی ہے اور ایک دن تباہ ہو کر ہی رہے گی۔ایک صاحب ایمان کے نزدیک اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ اس تباہی کا مقررہ وقت معلوم کیا جائے، یہ تباہی تو کسی بھی وقت آسکتی ہے، عین اس وقت بھی کہ جب''ناسا'' والے بالکل مطمئن اور بے خوف بیٹھے ہوں کہ ابھی چار ارب سال تک تو اس دنیا کے تباہ ہونے کے کوئی امکانات نہیں، کیونکہ یہ تباہی ناسا والوں کی نہیں، اللہ کی اجازت اور مرضی سے آنی ہے جو بحر و بر کا بادشاہ اور بلا شرکت غیرے مالک ہے۔اس کے ایک ہی اشارہ سے ہوائیں، پہاڑ، سمندر، ستارے، زلزلے، وبائیں، سیلاب، آفتیں اور سینکڑوں قسم کی بلائیں پلک جھپکتے میں اس دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر تہس نہس کر سکتی ہیں۔ایک مسلمان کی نگاہ میں اصل مسئلہ یہ ہونا چاہیے کہ میں نے تباہی کے اس دن کے لیے کیا تیاری کی جب ماں بیٹے کو بھول جائے گی اور اولاد والدین کو۔آسمان پھٹ پڑے گا، زمین میں خوف ناک زلزلے ہوں گے، ایسی خوف ناک اور ہیبت ناک آندھیاں چلیں گی کہ پہاڑ روئی کے گالے بن جائیں گے، قبریں شق ہونے لگیں گی اور اندر سے مردے نکل رہے ہوں گے، ستارے بکھرتے ہوئے نظر آئیں گے، سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی، صور اسرافیل کی دہشت ناک آواز کانوں کے پردے پھاڑ رہی ہوگی اور دہشت و وحشت کے اس عالم میں چھ فٹ کے انسان کو اپنی اوقات یاد آجائے گی۔تب بدحواسی اور وحشت زدگی کی حالت میں اس کی آنکھیں تن جائیں گی اور وہ سوچنے پہ مجبور ہو جائے گا کہ کیا اس نے آج کے دن کے لیے کوئی نیکیاں ذخیرہ کی تھیں یا لہو و لعب اور شغل و مستی کے اندر ہی اپنی ساری زندگی برباد کر آیا ہے۔ایک طرف شرمندگی، افسردگی اور خوف زدگی کی خوف ناک تصویریں ہوں گی، جن کی کتاب ان کے بائیں ہاتھ میں پکڑائی جائے گی۔ان کے چہرے ہیبت ناک حد تک سیاہ اور تاریک پڑ جائیں گے۔ دوسری طرف کچھ کھلکھلاتے اور مسکراتے چہرے ہوں گے، جن کے دائیں ہاتھ میں ان کا اعمال نامہ پکڑایا جائے گا۔ خوشی اور مسرت ان کے انگ انگ سے پھوٹ رہی ہوگی اور لوگ ان کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھیں گے۔ان کا بس نہیں چل رہا ہوگا کہ کس طرح خوشی کا اظہار کریں اور سب محشر والوں کو بتائیں کہ انھیں کتنی بڑی کامیابی کا پروانہ مل گیا ہے۔جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا، زمین دہکتا توا بن جائے گی، دنیا میں گزری زندگی کے پل پل کا حساب ہوگا،

شعلے اگلتی جہنم سامنے ہوگی، پل صراط بڑے بڑوں کا پتہ پانی کر دے گی، میزان اعمال کے پاس عجیب مناظر ہوں گے۔ اس دن صرف وہی بچ پائے گا جسے خدا کی رحمت اپنی آغوش میں لے لے گی۔ اس رحمت کو متوجہ کرنے اور اپنا مقدر سنوارنے کا آج بہت انمول موقع اس زندگی کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمیں ہر جہت اور ہر پہلو سے اللہ کے رنگ میں رنگ جانا چاہیے اور ہر اس چیز سے ڈرنا چاہیے جس سے اس مالک الملک نے ہمیں ڈرایا ہے۔ یہی ڈرنے کی اصل باتیں ہیں۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر*

جامعہ الازہر اور مصر سے رخصتی پر

[جامعہ الازہر قاہرہ میں تین سال تک تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد یہاں سے رخصت ہوتے وقت جامعہ کے کلیہ لغات و ترجمہ کی جانب سے ۲ جنوری ۲۰۱۱ء کو دی جانے والی الوداعی تقریب سے کیے گئے انگریزی خطاب کا اردو ترجمہ۔]

جناب ڈین صاحب، صدر شعبۂ اردو، اساتذۂ کرام کلیہ لغات و ترجمہ جامعہ الازہر، رفقاے محترم، میں آپ سب حضرات کا شکر گزار ہوں کہ آپ آج اس موقع پر جو کہ تین سالہ قیام کے بعد جامعہ الازہر میں میرا آخری دن ہے تشریف لائے اور میرے لیے اس دن کو یادگار بنایا۔

آج اپنے اس تین سالہ قیام کی تکمیل پر بیتے ہوئے تین سالوں کے نقوش میری نگاہوں میں ابھر رہے ہیں، میں جب یہاں آیا تو ایک حد تک میرے لیے سب کچھ نیا تھا اور امکانات سے بھرپور، اور آج جب میں آپ سے رخصت ہو رہا ہوں تو میرے لیے کچھ بھی اجنبی نہیں ہے سوائے خود میرے کہ میں آپ کے لیے اجنبی تھا اور ایک اجنبی ہی کی حیثیت سے رخصت ہو رہا ہوں:

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک
ہمہ گفتند با ما آشنا بود
و لیکن کس ندانست ایں مسافر
چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

* پروفیسر و صدر نشین مسند ظفر علی خان، ادارہ علوم ابلاغیات، جامعہ پنجاب، لاہور

رفیقان محترم آج اس موقع کی مناسبت سے شاید یہ بتانا مناسب ہوگا کہ تین برس قبل میں نے مصر کا انتخاب کیوں کیا......؟ جامعہ الازہر میں مسند اردو ومطالعہ پاکستان کے لیے انتخاب کے موقع پر پاکستان کے وزیر تعلیم کی جانب سے مجھے بعض دوسری مساند اردو ومطالعہ پاکستان کی پیش کش بھی کی گئی تھی، لیکن میں نے موجود مساند میں سے اپنے لیے مصر اور اس میں سے بھی جامعہ الازہر کو منتخب کیا تو اس کے پس پردہ میرے کون سے خیالات کار فرما تھے......؟

میں بحمداللہ ایک مسلمان ہوں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے قرآن حکیم کے الفاظ ومطالب پر غیر متزلزل یقین رکھتا ہوں قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ قرآن باقی رہے گا، سورۂ حجر ۱۵:۹ 'اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ' قرآن باقی رہے گا تو اسلام بھی باقی رہے گا، اسلام باقی رہے گا تو اس کی تہذیب بھی باقی رہے گی تہذیب کی بقا زبان سے وابستہ ہوتی ہے اس لیے عربی زبان بھی باقی رہے گی، گویا اسلام اور عربی زبان وتہذیب کی بقا ایک دوسرے سے وابستہ ہیں...... یہ ہے وہ وجہ جس کی بنا پر ہم اہل پاکستان عربی اور عربوں سے والہانہ محبت رکھتے ہیں۔ ہمارے لیے مصر عالم عرب میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتا ہے یہاں کا ادب، یہاں کی تاریخ، تمدن اور عالم عرب میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ملک ہونا وہ حوالے ہیں جو ایک پاکستانی کو اس کی طرف مائل کر سکتے ہیں اور یہی وہ عناصر ہیں جنھوں نے میرے یہاں آنے کے فیصلے، یہاں کی قدیم ترین جامعہ الازہر کا انتخاب کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا......۔

حاضرین کرام! عالمی صورت حال پر نگاہ رکھنے والوں سے آج مسلمانوں کی صورت حال پوشیدہ نہیں تعلیم سائنس ٹیکنالوجی سیاست کسی بھی شعبے میں ہمارا شمار ترقی یافتہ قوموں میں نہیں ہو رہا اور مستقبل قریب میں بھی صورت حال تبدیل ہوتی دکھائی نہیں دے رہی اس لیے کہ ہمارے ذہین افراد اغیار کی خدمت میں مصروف ہیں ہماری جامعات جو علم وفن کے مراکز ہیں جہاں سے نئی نسلوں کے قافلوں کو امید اور روشنی کے پیامبر بن کر نکلنا چاہیے اپنی محلی سیاستوں کا شکار ہیں نوجوان فکر معاش سے بلند کسی سوچ کے حامل نہیں ہیں باصلاحیت نوجوانوں کا جوہر ادراک فروختنی مال بن چکا ہے اساتذہ اپنے مسائل کا شکار ہیں......۔

ہم عجمی راہ نمائی کا تاج ہمیشہ سے عربوں کے سر پر رکھتے آئے ہیں آج بھی اہل عجم کی نگاہیں عربوں پر ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ چودہ صدیاں قبل جس قوم نے صحرا سے نکل کر روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا وہ شیر ایک بار پھر ہوشیار ہوگا اور دنیا کی تاریخ تبدیل کر دے گا......لیکن بہت دیر ہوگئی شیر مسلسل خواب میں ہے......میں اسی خواب کے تین سال دیکھ کر واپس جا رہا ہوں اس خواب کے ساتھ کہ یہ شیر کبھی تو ہوشیار ہوگا......۔

میں نے اپنے زمانۂ قیام مصر میں اپنی زبان اور قلم سے مسلسل اس شیر کو بیدار کرنے کی کوشش کی میں نے اپنا پیغام

اہل مصر کی سماعتوں تک پہنچا دیا...... اس امید کے ساتھ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ صبح ضرور طلوع ہوگی، جب عالم اسلام ایک نئی کروٹ لے گا آج کل بھی میرا جو سلسلۂ مضامین آپ کے ہاں شائع ہو رہا ہے جس کی آخری قسط میری مصر سے روانگی کے بعد شائع ہوگی، اس میں بھی میں نے اپنے مصر آنے کے فیصلے اور یہاں قیام کے حوالے سے اپنے تاثرات بیان کیے ہیں اور بتایا ہے کہ: مصر آنے کا فیصلہ کرتے ہوئے میرے پیش نظر عالم عرب میں مصر کی اہمیت اور اس کی قدیم تہذیب و تاریخ تھی ۔ یہاں کے تین سالہ قیام میں میرا ہدف اسلام، عالم عرب اور پاکستانی زبان و تہذیب رہے۔ جامعہ الازہر میں تدریس ہو یا عرب ممالک کی سیاحت، میں نے عالم عرب کو وہ سبق یاد دلانے کی کوشش کی جو بظاہر فراموش کیا جا چکا ہے اس مقصد کے لیے سب سے موزوں آواز اقبال کی تھی جس نے عجمی ہونے کے باوجود خود کو عربوں کا شاعر قرار دیا۔ قیام مصر کے زمانے میں مجھے کئی بار اقبال کی یہ آواز سنائی دی کہ ''مصریان افتادہ در گرداب نیل'' اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوتا رہا کہ آخر اقبال جیسا شاعر جس نے اہرام مصر اور ابوالہول کو اپنے فنکارانہ تخیل کا لمس عطا کیا اور نیل کے ساحل سے تابہ خاک کاشغر مسلمانوں کے اتحاد کا خواب دیکھا، رموز بے خودی میں ''در معنی ایں کہ ملت محمدیہ نہایت زمانی ندارد کہ دوام ایں ملت شریفہ موعودہ است'' کے زیر عنوان یہ کہنے پر کیوں مجبور ہوا کہ مصری امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے اور ان کی ہڈیاں اہرام کے نیچے دبی رہ گئیں:

مصر ہم در امتحاں ناکام ماند

استخوان او تہ اہرام ماند

تاریخ عالم میں مصر کی اہمیت کو تسلیم کرنے اور مصر سے محبت کرنے والے ایک قاری کی حیثیت سے اس سوال کا جواب بھی مجھے اقبال ہی کے کلام میں ملا جس سے میں اپنے زمانۂ قیام مصر میں اپنے قارئین کو آگاہ کرتا رہا جس پر مصری گزٹ The Egyptian Gazette کے شمارے گواہ ہیں۔

اب جبکہ اپنے تین سالہ قیام مصر کا دورانیہ مکمل کر کے واپس پاکستان جا رہا ہوں تو میرا ضمیر اس بات سے مطمئن ہے کہ میں نے اپنے قارئین کو تصویر کا حقیقی روپ دکھایا اور ایک ایسے راستے کی نشان دہی کی جس پر چل کر آج بھی انسانیت اپنی بھولی ہوئی منزل کو پا سکتی ہے۔

گزشتہ تین برس تک یہاں شائع ہونے والی میری تحریروں کے قارئین جانتے ہیں کہ میرا پیغام علم و فضل کی محبوبہ کو جو آج یورپ کے ہاتھوں میں جا کر شوخ و شنگ ہو چکی ہے واپس گھر لانے اور ایمان آشنا کرنے کا پیغام ہے۔ میں صورت حال سے مایوس ہونے کے بجائے اچھے مستقبل کی آمد پر یقین رکھتا ہوں...... اس لیے کہ اگر ہم سے رجائیت

بھی چھن گئی تو گویا ہم سے ساری خیر ہی چھن جائے گی......۔

جامعہ الازہر میں اپنے تین سالہ قیام کی یادگار کے طور پر میں آج اپنی جانب سے پانچ سو چونسٹھ اردو، عربی اور انگریزی کتابوں کا تحفہ آپ کی لائبریری کو پیش کر رہا ہوں۔ یہ کتابیں جو میں نے ذاتی حیثیت میں فراہم کی ہیں، پاکستان اور اہل پاکستان کا پیغام محبت آپ تک پہنچاتی رہیں گی اور جہاں یہ آپ کی فیکلٹی کے طلبہ وطالبات کی تحقیق کی ضروریات کو پورا کریں گی وہاں آپ کو یہ بھی یاد دلاتی رہیں گی کہ کبھی ایک اجنبی آپ کی جامعہ میں آیا تھا جس نے تین برس آپ کی سماعتوں پر دستک دی تھی اور جو ایک اجنبی ہی کی حیثیت سے رخصت ہوا۔

طالب محسن

دین میں ظاہر داری/ جھوٹ کا اثر

دین داری عام طور پر ظاہری رکھ رکھاؤ یا رسوم و رواج کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اعمال و کلمات کے پیچھے کارفرما اصل روح نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ نماز، روزہ اور صدقہ و خیرات کے لیے ظاہری آداب یا کچھ رسوم کی پاس داری کے لیے بہت کچھ زور جذبے سے کام لیا جاتا ہے، لیکن ان کے ساتھ وابستہ وہ ذہنی اور قلبی کیفیت بالکل مفقود ہوتی ہے، جس کے بغیر کوئی نیکی بارگاہِ ایزدی میں شرف باریابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتی۔

نماز میں ٹوپی سے سر ڈھانپنا، پائنچوں کا ٹخنوں سے اونچا ہونا اور قیام و سجود میں نمازی کی ہیئت جیسے ظواہر، بالعموم، زیر بحث آ جاتے ہیں۔ لیکن اللہ کی یاد، اعتدال و توازن، اور جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کے فہم و ادراک جیسی اصل اہمیت کی چیزیں کم ہی التفات کے قابل ٹھیرتی ہیں۔

اسی طرح روزے میں سحر و افطار کے وقت کی تعیین اور کھانے پینے کی چیزوں کی خرید و فروخت پر پابندی جیسے مسائل ہماری توجہات کے زیادہ حق دار قرار پاتے ہیں، لیکن للٰہیت، ترک لذت کے جذبے اور تقویٰ کی آب یاری کے لیے کاوشوں کو کم ہی اہمیت دی جاتی ہے۔

صدقہ و خیرات کا عمل تو، بالعموم، ظاہری رسوم تک محدود ہو جاتا ہے۔ یہ من گھڑت چہلم اور قل، گیارھویں اور میلاد کی مجلسیں، عید میلاد کے موقع پر جلوس اور بازاروں کی تزیین اور آرایش اور اسی طرح رمضان میں شان و شوکت کے اظہار پر مبنی افطاریاں، ہم مسلمانوں کے جذبۂ ایثار کی تکمیل کر دیتی ہیں۔ لیکن خیرات کا وہ عمل بالکل معدوم ہوتا جا رہا ہے جس میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ سے بے خبر رہتا ہے۔ بھوکا سونے والے ہم سائے کی خبر گیری کے لیے بے چینی، بے آسرا یتیموں اور بے سہارا بیواؤں کی مدد کے لیے سرگرمی اور دین کے فروغ کے لیے بڑھ چڑھ کر مالی

تعاون کے جذبات ہمارے اہل خیر میں خال خال ہی نظر آتے ہیں۔

اذان سے پہلے درودوسلام، نماز کے بعد بعض کلمات کا ورد اور اسی طرح کے بعض دوسرے مسائل بہت کچھ بحث و جدال کا سامان بنتے ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی عقیدت کہ آدمی اس دین سے سرمو انحراف یا اس پر ذرہ برابر اضافے کے لیے تیار نہ ہو جو نبی اکرم نے ہمیں سکھایا ہے، ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ آپ سے عقیدت ومحبت قلب وذہن کی زندگی ہے، لیکن اس کے خود ساختہ معیارات کی تبلیغ کچھ ایسے شدومد سے کی جاتی ہے کہ غالباً حقیقی دین یہی ہے۔ لیکن ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ:

''اللہ تعالیٰ تمھاری صورتوں اور تمھارے جسموں کو نہیں دیکھتے، ان کی نظر تو تمھارے دلوں پر ہے۔'' (مسلم)

اگر ہمارے دل دین کی روح اور حقیقت سے خالی ہیں تو پھر ہمارے یہ ظاہری اہتمام کیسے شرف قبولیت سے بہرہ ور ہوں گے!

برا عمل دل پر برے اثرات مرتب کرتا ہے۔ دل کی طہارت اور صفائی کے لیے برائی کے سرزد ہونے کے فوراً بعد تائب ہونا ضروری ہے، خواہ یہ برائی بظاہر بہت معمولی کیوں نہ ہو۔ اس طرح بعض برائیاں دوسری برائیوں کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ چنانچہ ایسی برائیوں سے اجتناب بہت ضروری ہے، ورنہ آدمی برائیوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

جھوٹ ایک ایسی برائی ہے۔ گھر کے معمولی معاملات سے لے کر تجارت اور سیاست تک، ہر شعبے میں ہونے والے بڑے بڑے جرائم کی بنا، بالعموم، جھوٹ ہی سے پڑتی ہے۔

اس کے برعکس سچ نیکی اور خیر کے فروغ کا باعث بنتا ہے۔ ایک راست گو آدمی اپنے معاملات، لین دین اور تعلقات میں بھی سچا اور دیانت دار ثابت ہوتا ہے۔ جس طرح جھوٹ کی زنجیر میں برائیاں بندھی چلی آتی ہیں اور ان سے بچنا، بسا اوقات، ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سچ نیکیوں کے جلو میں چلتا ہے اور آدمی کو برائیوں کے اثرات بد سے بچنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

اس حقیقت کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی خوبی سے واضح کیا ہے:

''ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچ فرماں برداری کی راہ دکھاتا ہے اور فرماں برداری جنت کی راہ ہموار کرتی ہے۔ آدمی سچ کو اپنا معمول بنالیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے ''صدیق'' لکھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ نافرمانی کی بنیاد بنتا ہے اور نافرمانی آگ کی طرف لے جانے والی چیز ہے۔ آدمی جھوٹ بولتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے ''کذاب'' لکھ دیا جاتا ہے۔'' (متفق علیہ)

قرآن مجید نے خدا اور بندے کے تعلق کو ''بندگی'' کے لفظ سے تعبیر کیا ہے: 'وما خلقت الجن والانس الا

لیعبدون ''، ''اور ہم نے انسانوں اور جنوں کو صرف ''بندگی'' کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔'' ''بندگی'' عبادت اور فرماں برداری کی جامع ہے۔ یعنی، بندۂ مومن صرف پروردگار عالم کی پوجا اور پرستش ہی نہیں کرتا، اس کے احکامات کی بے چون و چرا تعمیل بھی کرتا ہے۔ اسی اطاعت گزاری کو اس حدیث میں فرماں برداری کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کو اسی فرماں برداری کی کلید قرار دیا ہے۔

انبیا جب دعوت لے کر کھڑے ہوتے ہیں، تو ان کی دعوت قبول کرنے اور اس کے علم کو اٹھانے والے لوگوں کو قرآن مجید نے ''صدیق'' قرار دیا ہے۔ یہ کسی مومن کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے کہ وہ خدا کے ہاں صدیق قرار پائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو صدیق کے مرتبے پر فائز ہونے کی خوش خبری دی ہے جو سچ کے دامن کو اپنی زندگی کے کسی گوشے اور کسی لمحے میں بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

سچ جس قدر خیر و برکت کی چیز ہے، جھوٹ اسی نسبت سے باعث آلام اور اندوہناک ہے۔ اس کو اپنی زندگی بنا لینے والا شخص ''کذاب''، یعنی منکر دعوت و رسالت قرار پا سکتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز آگ کے عذاب ہی کا باعث بنے گی۔

اختلاف اور علمی رویے

ہمارے ہاں، علمی مذاکرے کے لیے، فضا سازگار نہیں ہے۔ علمی تنقید و تجزیہ، اختلاف کے بجائے، بالعموم، مخالفت پر محمول کیا جاتا۔ بطور خاص، وہ لوگ، جو کسی خاص فکر کے داعی ہوتے ہیں، اور اسی حوالے سے، معاشرے میں ان کی ایک شناخت ہوتی ہے، ان کی طرف سے اکثر و بیش تر، صحیح رویہ سامنے نہیں آتا۔ وہ جو کچھ بھی کسی نقد و اعتراض کے سلسلے میں لکھتے یا کہتے ہیں، وہ محض ایک جوابی کارروائی ہوتی ہے۔ اسے کسی طرح بھی علمی تنقید نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ علمی تنقید کے کچھ مسلمہ اصول ہیں اور اس طرح کی تحریروں یا تقریروں میں یہ اصول کم ہی ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔ ایک اہم اصول، جسے ہم علمی تنقید کا اصل الاصول قرار دے سکتے ہیں، وہ بھی اس سلسلے میں دیے گئے جوابات میں پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ مخاطب کے نقطۂ نظر کی اصل و فروع کو متعین کرنے کے بعد، پہلے اصل اور بعد میں فروع کو زیر بحث لایا جائے، اس لیے کہ ہر علمی نقطۂ نظر کسی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، لہٰذا، اگر بنیادی غلطی کی نشان دہی نہیں کی جائے گی، تو فروع پر چلائے گئے تیشے کوئی حقیقی نتیجہ پیدا نہیں کر سکیں گے۔ اور دوسری

طرف اصل و بنیاد کو نظر انداز کر کے محض اجزا کو زیر بحث لانے سے یہ تاثر ہوتا ہے کہ جواب دیتے وقت اصل حقیقت سے گریز کر کے محض الجھاؤ پیدا کرنا مقصود ہے۔ چنانچہ قارئین، بسا اوقات، یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ تنقید کرنے والے کے پاس پیش آنے والے سوالات کا کوئی جواب نہیں ہے۔ درآں حالیکہ، دین کا ایک عالم جس کی قرآن و سنت پر نظر ہو، اور اس نے دوسرے اہل علم سے فیض صحبت بھی پایا ہو، وہ جو نقطۂ نظر بھی اختیار کرتا ہے، اس کے بارے میں یہی سمجھنا چاہیے کہ اس کی بنیاد کسی خواہش پر نہیں، بلکہ قرآن و سنت پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کی رائے کو قبول یا رد کرنے میں عجلت یا جذباتیت سے گریز لازم ہے۔ اگرچہ صاحب علم جس درجے کا بھی ہو، ضروری نہیں کہ اپنی ہر تحقیقی کاوش میں صحیح نتیجہ ہی اخذ کرے۔ اور یہ ایک ایسی واقعی حقیقت ہے کہ علمی دنیا سے متعلق کوئی بھی شخص، اس کا انکار نہیں کر سکتا۔

ایک اور اہم حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ بسا اوقات، کسی رائے میں غلطی بہت دور بنیاد میں واقع ہوتی ہے۔ اس طرح کی صورت حال میں تنقید، بالعموم، غیر حقیقی محسوس ہوتی ہے اور آدمی کو باور نہیں آتا کہ 'محکم بنیادوں' پر قائم کسی کا فکری نظام ایسا غلط بھی ہو سکتا ہے۔

دعوت کا کام کرنے والوں کو جاننا چاہیے کہ اپنے عقیدے یا عمل میں غلطی مان لینا، اس دارالامتحان کی ایک بڑی آزمایش ہے۔ لیکن، اس میں بھی شبہ نہیں کہ ہر بڑی آزمایش کی طرح اس میں بھی پورا اترنے والے کے لیے بڑا اجر ہے۔ چنانچہ تنقید کے جواب میں ایک ہی رویہ ایسا ہے جو روز آخر میزان کو بھاری کرے گا اور وہ یہ ہے کہ اپنی رائے میں غلطی کا امکان مان کر تنقید کو دیکھا جائے اور دل میں بھی یہی خیال رہے کہ ہو سکتا ہے تنقید کسی حق کو دریافت کر لینے میں مددگار ثابت ہو۔ ہر صاحب حق کے لیے یہی ایک راستہ ہے جو اسے بہرحال، اختیار کرنا چاہیے۔ دوسری طرف تنقید کرنے والے کا اصل محرک بھی دین کے لیے خیر خواہی اور فرد سے ہمدردی پر مبنی ہونا چاہیے اور اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کی تنقید بھی غلط ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کے پیش نظر ہمیشہ احقاق حق ہو اور اس کی غرض دوسرے کو، ہر حال میں غلط ثابت کرنا نہ ہو۔

یہ ایک عالم گیر سچائی ہے کہ آخری کامیابی حق ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر حق سے گریز کی جائے گی، تو آدمی کامیابی سے یقیناً محروم ہی رہے گا، خواہ یہ حق کسی ایسے آدمی کے پاس ہو جو، ہمارے نزدیک، پسندیدہ نہیں ہے، اور خواہ ہماری آرا برسوں کی سوچ بچار کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہوں۔

اشاریہ
عقیل احمد انجم

اشاریہ ماہنامہ ''اشراق'' ۲۰۱۲ء

قرآنیات

معارف نبوی

دین و دانش

شذرات

نقطۂ نظر

نقد ونظر

سیر وسوانح

یسئلون

اصلاح ودعوت

حالات و وقائع

وفیات

اشاریہ